اختر صدیقی
(ڈی لکس ایڈیشن)
غالب
اپنے آئینے میں

خالص اللہ کی رضا اور جذبۂ خدمتِ خَلق کے تحت کتب کی پی ڈی ایف فائلز بنائی جاتی ہیں۔

کسی بھی قسم کا کاروباری مفاد پیشِ نظر نہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ شکریہ

PDF By : Ghulam Mustafa Daaim

(ڈی لکس ایڈیشن)
غالبؔ
اپنے آئینے میں
اختر صدیقی
rekhta

بار اوّل اپریل ۱۹۷۰ء

قیمت : چھ روپے

بھارتی پبلیکیشنز، ۲۰۵ گڑھیا، جامع مسجد دہلی ۶
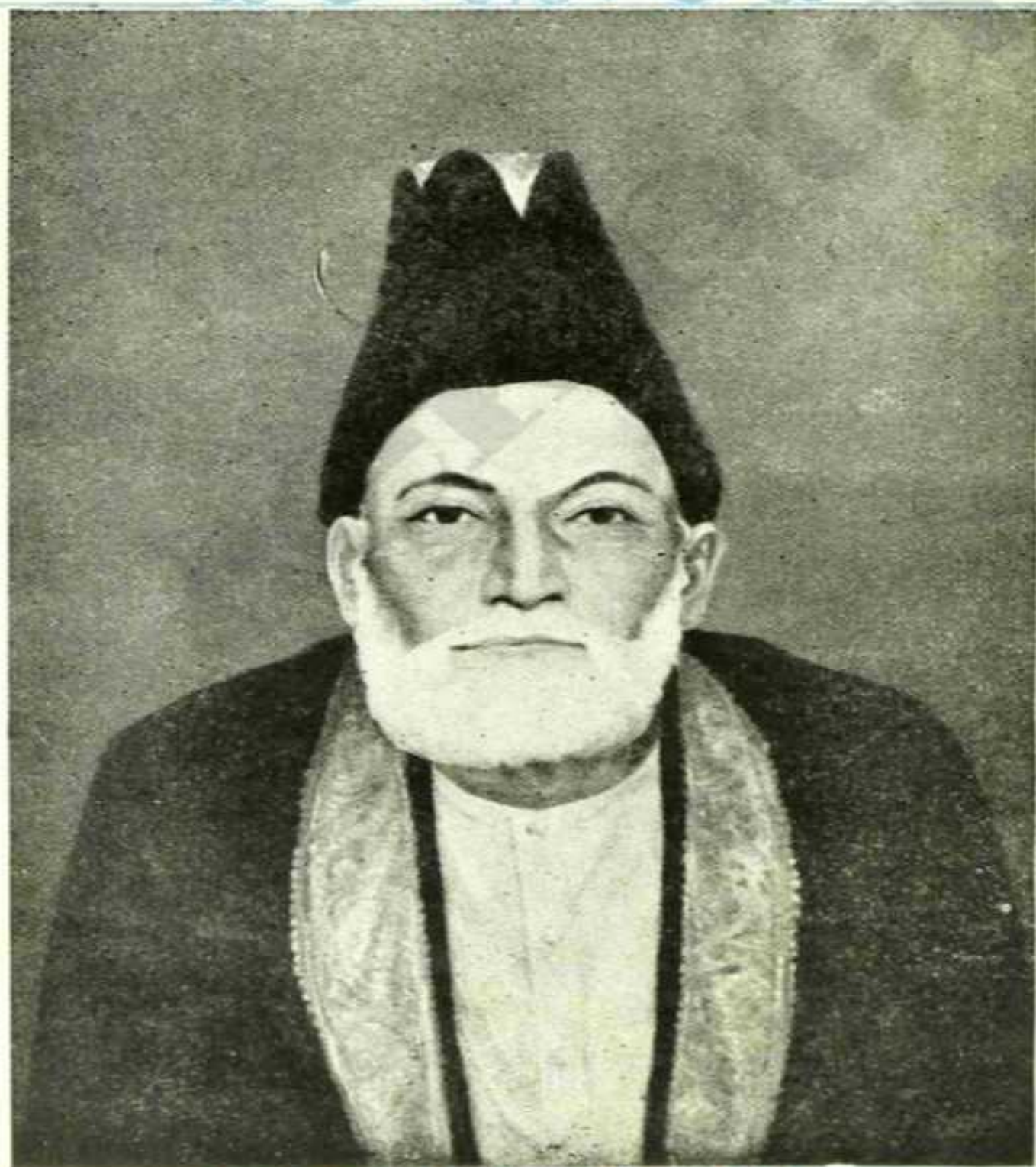
عرضِ ناشر

مجھے مسرت ہے کہ "بھارتی پبلیکیشنز" اختر صدیقی صاحب کا "غالب اپنے آئینے میں" شائع کر رہا ہے۔ اختر صدیقی صاحب سے میری بیس پچیس سال کی واقفیت ہے۔ وہ ایک پرانے صحافی ہیں اور اودھ اخبار لکھنؤ، سیاست کانپور، روزنامہ نئی دنیا دہلی، روزنامہ پیام وطن نئی دہلی، وغیرہ اخباروں میں ادارتی خدمات انجام دیتے ہوئے کم و بیش تیس سالہ صحافتی تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں لیکن مشاعروں سے نہ صرف کتراتے بلکہ بھاگتے ہیں۔ شاید اپنے کریہہ الصوت ہونے کی بنا پر یا شاید مشاعروں کے موجودہ اخلاقی معیار کی وجہ سے بہر صورت دوستوں کا ایک قریبی حلقہ ان کے کلام سے مستفیض ہوتا رہتا ہے اور اسی سلسلے میں مجھے اکثر ان کے اشعار سننے کا اتفاق ہوا اور میں ان کے اشعار سے کافی متاثر اور ان کی خوبیٔ کلام کا معترف ہوں ان کے کلام میں نیر نظر اور پتھر کے جگر کے تذکرے نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے حقیقی پہلوؤں کی عکاسی و ترجمانی ہوتی ہے۔

اختر صدیقی صاحب شاعر سے زیادہ نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور احباب کی مجالس میں شعرائے قدیم و جدید کے کلام پر ان کے تبصروں سے نہ صرف میں بلکہ ان کا حلقہ احباب کافی متاثر ہوتا ہے اور اس باب میں ان کے گہرے ادبی مطالعہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

اختر صدیقی کا ایک خصوصی رجحان یہ ہے کہ وہ عام راستے سے ہٹ کر کچھ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے اسی رجحان طبع اور اپنی اسی روش کی بنا پر ایک ایسے مرحلہ اور ایک ایسے موقع پر جبکہ غالب کی مدح سرائی عام ہو رہی ہے انھوں نے مرزا غالب کی زندگی اور ان کے کلام پر نکتہ چینی پسند کی ہے۔ لیکن نکتہ چینی کے لئے خود اپنے تاثرات کی بجائے خود غالب کی تصانیف و خطوط اور ان کے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالی کی یادگارِ غالب اور دیگر ایسی

ہی کتب کو بنیاد قرار دیا ہے

اختر صاحب نے اس کتاب کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری بھی مجھ ہی پر ڈال دی اور چونکہ انھوں نے تمامتر نکتہ چینی خاص طور سے خود غالب کی تحریروں کی بنا پر کی ہے۔ اس لئے میں نے اس کتاب کا نام " غالب اپنے آئینے میں " تجویز کیا ہے۔

میں نے اختر صاحب پر زور دیا تھا کہ وہ کسی سے اس کتاب کا مقدمہ لکھائیں لیکن انھوں نے اس کو ایک فرسودہ رسم قرار دیکر اپنی انفرادی روش اور جدت طراز رجحان طبع کے تحت اس سے انکار کر دیا اور میں نے بھی ان کی اس ادبی خودداری کا احترام کرتے ہوئے ان پر زیادہ زور نہیں دیا اور بہرصورت اب ہم ان کی اس تالیف کو ان کی مرضی کے مطابق بغیر کسی تعارف و مقدمہ کے شائع کر رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے بھی اختر صدیقی صاحب کی اس دلیل سے اتفاق کرنا ہی پڑا کہ کسی تصنیف یا تالیف پر مقدمہ یا تعارف اس کتاب کے قارئین کے ساتھ اخلاقی زیادتی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ حق قارئین کا ہی ہونا چاہئے کہ وہ کسی مقدمہ نگار کی سفارش سے متاثر ہوئے بغیر خود کتاب کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں۔ اور اس کے پڑھنے کے بعد خواہ اس کو مسترد کریں خواہ شرف قبولیت بخشیں۔ اختر صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اور اس قول پر یقین رکھتے ہوئے اس کتاب کو شائع کر رہا ہوں کہ۔

گلفروشے ما کہ خواہد گل بہ بازار آورد
باید اول تاب غوغائے خریدار آورد

رشید حسیب

17-3-70

تاثر

"غالب اپنے آئینے میں" برادرم اختر صدیقی صاحب کی تازہ تالیف ہے اور اس میں مرزا غالب ہی کی اپنے متعلق بہم پہونچائی ہوئی معلومات سے ان کی زندگی اور ان کے کلام پر غیر ضروری عقیدت مندی کی راہ سے ہٹ کر ایک خاص زاویہ سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تنقید کا یہ ایک صحت مند انداز ہے کہ روایت پرستی کی عام روش سے ہٹ کر حقائق کو سامنے لایا جائے۔

روزنامہ دعوت کے لئے میں نے اکثر اختر صاحب کو اردو کی بعض ادبی کتب پہ تبصرے لکھنے کی زحمت دی ہے۔ اور اس میں بھی انھوں نے ایسا ہی اچھوتا انداز اختیار کیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس تالیف میں بھی اپنا رنگ برقرار رکھ سکے ہوں گے۔ اور اردو ادب میں صحت مند تنقید نگاری کا حق ادا کیا ہوگا۔

محمد مسلم

چیف اڈیٹر دعوت دہلی

انتساب

خدائے سخن میر تقی میر کے نام جن کے متعلق ناسخ کے اس قول کو کر

ع "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں" غالب نے اپنے لئے عقیدے کا درجہ دیا

اور جنہوں نے غالب کا ابتدائی کلام سن کر کہا تھا کہ

"اگر اس لڑکے کو کوئی استاد کامل مل گیا اور اس نے سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا"

اور جو حرف بحرف صحیح ثابت رہا۔

اور

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے نام جنھوں نے اپنی کتابوں آبِ حیات و نیرنگ خیال میں پہلی بار غالب کے کلام پر مختصر سہی مگر صحت مند تنقید کی۔

اختر صدیقی

حرفِ آغاز

بنام جہاندار جان آفرین　　　حکیم سخن بر زبان آفرین

انیسویں صدی عیسوی کا وہ ہندوستانی شاعر جس نے ہمیشہ خود کو ترک ثابت کرنے کی کوشش کی اور ایرانی تمدن کو اپنایا۔ مرزا غالب تھا۔ جس نے ہمیشہ اردو شاعری سے مالی منفعت حاصل کی لیکن فارسی شاعری پر فخر کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام عمر اپنے ذہن میں ایرانی ثقافت و ادب کی ہندوستانی ثقافت و ادب پر برتری کے جذبہ کی پرورش کرتا رہا۔ وہ ایک فوجی جاگیردار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا نام مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشا اور تخلص اسد اور غالب تھا۔ وہ ایرانی طرز کا لباس۔ قبا اور کلاہ پا پاخ پہنتا تھا۔ اور ایرانی تہذیب اختیار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن وہ پیدا ہندوستان میں ہوا تھا۔ رہتا ہندوستانیوں ہی کے ساتھ تھا۔ کھاتا ہندوستان ہی کا تھا۔ اور ہندوستان ہی کے بادشاہوں۔ نوابوں۔ جاگیرداروں اور ہندوستان پر حملہ آور اور قابض انگریز حکام سے ان کی مدح سرائی اور خوشامد کر کے بڑی بڑی اور چھوٹی چھوٹی رقمیں حاصل کرتا تھا۔ جن میں کچھ کو پنشن سمجھتا تھا۔ کچھ کو تنخواہ کہتا تھا اور کچھ کا نام اس نے "فتوح" رکھ چھوڑا تھا۔ اس شاعر کی قلعہ معلیٰ کے شاہی دربار میں بھی رسائی تھی۔ نوابوں اور جاگیرداروں کی مدح سرائی بھی کرتا تھا۔ انگریز حکام تک بھی پہنچتا تھا۔ باوجودیکہ اس نے اپنی فکر و طبع اور ذہن و جذبات کا زیادہ زور فارسی شاعری پر صرف کیا۔ اور فارسی میں غزلیات، قصائد، مثنویات، رباعیات، وغیرہ کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ اکٹھا کر لیا تھا لیکن ایران نے کبھی اس کو منہ نہ لگایا اور ایرانیوں نے اس کے فارسی کلام کو ہمیشہ ایران کے اہل زبان شعرا کے مقابلہ میں کم تر قرار دیا۔ لیکن اس کے بہت ہی قلیل اردو کلام کو ہندوستان میں بیحد سراہا گیا۔ اور انتہا یہ ہے کہ اس شاعر کے انتقال کے سو سال بعد اعلیٰ سطح پر

اس کی صد سالہ یادگار منائی گئی۔ ۱۹۶۹ء اس کی صد سالہ یادگار کا سال قرار دیا گیا اور اس سال کے دوران غالب اکیڈمی کی جانب سے خاص کر اور اس کے علاوہ بھی متعدد اداروں کی جانب سے غالب کی زندگی اور اس کے کلام پر بہت سی کتابیں شائع کی گئیں اور ان میں سے اکثر کتابیں اردو کے مستند، تجربہ کار اور کہنہ مشق ادیبوں، پروفیسروں اور مصنفوں سے لکھائی گئیں اور بہت سے اخباروں اور خاص کر رسالوں نے "غالب نمبر" شائع کئے۔ لیکن یہ بات افسوسناک ہے اور اس سے اردو کی تنقیدی کم مائگی کا اظہار ہوتا ہے کہ قریب قریب سبھی لکھنے والوں نے غالب کی زندگی اور غالب کے کلام کا صرف ایک رخ یعنی روشن پہلو پیش کرنے کی کوشش کی۔ سب ایک ہی ڈھرے پر چل پڑے اور سبھی کا نعرہ ایک تھا کہ۔ غالب اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں" اور اس بات کو ثابت کرنے کی سبھی نے کوشش کی۔ آب حیات اور نیرنگ خیال میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے "سخن فہم" بن کر مرزا غالب پر لکھ کر لیکن مختصر ترین جو تنقید کی ہے اس سے متاثر ہو کر مولانا الطاف حسین حالی نے جو غالب کے شاگرد رشید بھی تھے "غالب کے طرفدار" بن کر "یادگار غالب" لکھی جس کے ذریعے انھوں نے اس صحت مند تنقید کا دروازہ بند کر دیا جو مولانا آزاد نے —— کھولا تھا اور غالب کی مدح سرائی میں مبالغہ آرائی کی ایک ایسی راہ کھول دی جس پر گذشتہ ایک صدی سے اردو کے نقادان سخن گامزن چلے آرہے ہیں۔ جہاں غالب کا نام آیا اور تنقید کرنے والا ذہن مرعوب ہوا۔ ہم نے اس سے ہٹ کر مرزا غالب کا پورا احترام کرتے ہوئے صحیح تنقید کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کو نہ سخن فہمی کا دعویٰ ہے نہ غالب کی طرفداری کا پھر بھی تنقید میں خوشگواری بھی ہوتی ہے اور تلخ گھونٹ بھی۔ اگر مقطع میں سخن گسترانہ والی کوئی بات معلوم ہو تو یہ سمجھ لیا جائے کہ ع ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

مرزا کا خاندان

اور مختصر حالاتِ زندگی

مرزا اسداللہ خاں غالب ۸ رجب المرجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ وہ ریاست الور میں کسی فوجی عہدہ پر تھے ۱۸۰۲ء میں راج گڈھ کی جنگ میں گولی سے زخمی ہوئے اور انتقال ہو گیا اس وقت مرزا غالب کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا صاحب کو ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے اپنی پرورش میں لے لیا نصراللہ بیگ خاں پہلے مرہٹوں کی ملازمت میں اکبرآباد کے صوبے دار تھے۔ انھوں نے انگریز جنرل لارڈ لیک کی ماتحتی میں بھی قابل قدر فوجی خدمات انجام دیں۔ جس کے صلے میں ۱۸۰۵ء میں انگریزوں نے آگرہ کے قریب سونک سونسا کا پرگنہ ان کو ان کی زندگی بھر کے لئے جاگیر میں دیدیا۔ لیکن ۱۸۰۶ء میں جبکہ غالب کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی نصراللہ بیگ خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال پر انگریزی حکومت نے ان کی جاگیر واپس لے لی اور ان کے ورثہ کی پنشن مقرر کر دی۔ مرزا غالب کو یہ پنشن شروع میں ریاست فیروز پور جھرکہ سے اور اس کے بعد کلکٹری دہلی سے ملتی رہی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ساتھ ہی یہ پنشن موقوف ہو گئی تھی۔ چچا کے انتقال کے بعد مرزا صاحب اپنے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی سرپرستی میں پہونچ گئے۔ خواجہ غلام حسین خاں آگرے کے ایک عالی خاندان رئیس تھے (یادگار غالب)

بھائی بہن مرزا غالب کی ایک بڑی بہن چھوٹی خانم تھیں اور ایک چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ خاں تھے جن کا دلی میں بحالت دیوانگی ۹ ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء انتقال ہوا (اردوئے معلیٰ)۔

شادی یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش ۸ رجب ہے اور ۸ رجب المرجب ۱۲۲۵ھ کو مرزا صاحب کی شادی بھی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ والی فیروز پور جھرکہ و جاگیر دار لوہارو نواب احمد بخش خاں امراؤ بیگم کے چچا تھے۔

اولاد امراؤ بیگم سے سات بچے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی پندرہ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے نواب زین العابدین خاں عارف کا ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوا ان کے پسماندگان میں دو خرد سال لڑکے باقر علی خاں اور حسین علی خاں تھے۔ ان دونوں کی والدہ کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا مرزا غالب نے ان دونوں بچوں کو متبنیٰ کر لیا تھا۔
حسب ذیل اشعار میں بھی انہیں عارف اور انہیں بچوں کا ذکر ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
ہم سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

دلی میں سکونت شادی کے بعد ہی مرزا دہلی آ گئے اور یہیں کی سکونت اختیار کر لی تاہم مرزا نے دہلی میں کبھی اپنا کوئی ذاتی مکان تعمیر نہیں کرایا اور تمام عمر کرایہ کے مکانوں میں بسر کر دی۔

قلعہ معلی سے تعلق یوں تو اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں ہی مرزا کو قلعہ معلی میں باریابی حاصل ہو گئی تھی لیکن اصل تعلق سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے دور میں قائم ہوا۔ اور ۱۲۶۶ھ میں بہادر شاہ ظفر نے مرزا کو خطاب و خلعت سے نوازا۔ اور خاندان تیموریہ کی تاریخ نگاری کا کام سپرد کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے رنگون میں نظر بند کر دیا۔ اور اس طرح لال قلعہ اور بہادر شاہ ظفر سے مرزا کا تعلق منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی انگریزوں نے مرزا کی پنشن بھی بند کر دی۔

مقدمہ اور قید ابتدا ہی سے مرزا میں شراب نوشی، قمار بازی، اسراف وغیرہ کی عادتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ جب قلعہ معلی کی آمدنی بھی ختم ہو گئی اور پنشن بھی بند ہو گئی تو ذریعہ آمدنی کے طور پر مرزا نے اپنے مکان میں قمار خانہ کھول دیا تھا اس سرگرمی

پر ان کے خلاف مقدمہ چلا اور ان کو سزائے قید ہو گئی۔ عنفوان جوانی میں مرزا نے ایک ڈومنی سے بھی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔

رام پور سے تعلق

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دو سال بعد مرزا کا تعلق رام پور سے ہوگیا اور دلی میں رہتے ہوئے مدح سرائی اور اصلاح سخن کے معاوضہ میں مرزا کو ریاست رام پور سے سو روپے ماہوار ملنے لگے۔

غدر کے تین سال بعد مرزا کی پنشن بھی دوبارہ جاری ہوگئی۔

انتقال

۲ ذیقعد ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو مرزا غالب کا انتقال ہوا۔ مرزا نے ۷۳ سال کی عمر پائی۔ آخر عمر میں آپ بیحد کمزور ہوگئے تھے۔ اور کچھ عرصہ سے موت کی بڑی آرزو رکھتے تھے۔ ضعف مایوسی اور خواہش مرگ سے ان کی حالت واقعی ان کے اس شعر کے عین مطابق تھی۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

موت سے کچھ قبل وقتاً فوقتاً یہ شعر مرزا کے ورد زبان رہتا تھا۔

دم واپسیں برسر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

خاندانی عظمت میں مبالغہ آرائی

غالب کے خاندان اور ان کی ابتدائی زندگی کے متعلق معلومات کی بنیادیں خود ان کے خطوط اور ان کی تصانیف ہیں۔ اور ان میں انھوں نے جو کچھ مناسب سمجھا تحریر فرما دیا

غالب نے اپنی تصنیف مہر نیمروز میں اپنی خاندانی عظمت کے متعلق مبالغہ آرائی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرا نسب تور ابن فریدون سے ملتا ہے اور کیانی دور میں تورانیوں کے زوال کے ساتھ مرزا کے آباؤ اجداد بھی ادھر ادھر ہو گئے۔ پھر کئی صدیوں کی گمنامی کے بعد تور ابن فریدوں کی اولاد نے سلجوقی سلطنت کی بنا ڈالی۔ جب سلجوقی بھی پسپا ہو کر تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئے تو اس کے کافی مدت کے بعد ایک بزرگ ترسم خاں نے سمرقند میں سکونت اختیار کی اور انھیں سے غالب نے اپنے اجداد کا سلسلہ مربوط کیا۔ مرزا غالب کے دادا توقان بیگ بدخشاں سے ہندوستان آئے تھے جس کا ذکر غالب نے مہر نیمروز میں ان الفاظ میں کیا ہے "چون سیل کہ از بالا بپستی آید از سمرقند بہند آمد۔ اگر یہ الفاظ قوقان بیگ کی زبان سے ادا ہوئے ہوتے تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ بدخشاں چھوڑتے وقت ان کے کچھ ایسے ہی جذبات رہے ہوں گے لیکن یہ الفاظ ان کے پوتے غالب کے ہیں۔ جو ہندوستان میں خود اپنے بیان کے مطابق تیسری نسل گزار رہے تھے اور اپنے وطن ہندوستان میں اپنے دادا کی آمد کو بلندی سے پستی کی جانب آنا قرار دیا ہے۔

مرزا نے اپنے خاندان کو فریدوں اور افراسیاب سے ملانے کی جو کوشش کی ہے اس کے متعلق نہ کوئی ثبوت بہم پہونچایا جا سکتا تھا اور نہ مرزا کوئی ثبوت بہم پہونچا سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے تاریخ سلف سے افراسیاب اور فریدوں کی شخصیتوں کو ممتاز منتخب کر لیا اور اپنے سلسلۂ خاندان کو ان

سے منسلک کر دیا۔ ہمیں مرزا کے اس دعوے پر یقین نہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ آل فریدوں اور دودمان افراسیاب تھے۔ لیکن اس کو ماننے کے لئے کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ کیونکہ مرزا نے ان مشاہیر سلف سے اپنا تعلق اسی انداز میں ظاہر کیا ہے جس انداز میں اس زمانہ کی کوئی بھی ہستی کسی بھی قدیم ہستی سے خود کو متعلق ظاہر کر سکتی ہے۔ اور چونکہ مرزا اس سلسلہ خاندان کو مربوط نہیں کر سکے اس لئے اکثر محققین نے ان کے سلسلہ نسب کے متعلق ان کے دعوے کو تسلیم نہیں کیا اور مرزا صاحب نے بھی یہ ربط قائم کرنے میں یہ کمال کر دکھایا کہ فریدوں اور افراسیاب سے صرف دو تین مرحلوں کا ذکر کر کے اپنے داداؤں کے سلسلۂ خاندان سے ملا دیا ہے اور ان تمام صدیوں کے دوران جو فریدوں اور افراسیاب سے ان کے دادا تک حائل ہیں۔ ناموں کے سلسلے نظر انداز کرنے کے لئے مرزا قطعی معذور و مجبور رہے ہیں۔

مرزا نے اپنے دادا کے خاندان کے قلابوں کو فریدوں و افراسیاب تک ملانے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اپنے دور کے طبقاتی مزاج سے مجبور ہو کر اپنی خاندانی عظمت ظاہر کر کے دنیاوی عزت و منفعت حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی ورنہ تحقیق اور حقیقت بیانی سے کام لیتے تو مرزا اس سے آگے اور کچھ نہ کہہ سکتے کہ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانہ میں سمرقند سے ہندوستان آئے اس سے پہلے ان کا خاندان کس سلسلے سے ملتا ہے اس کا ان کو کوئی علم نہیں۔ لیکن مرزا نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ وہ کافی ذہین تھے۔ اور ان کے ذہنِ رسا نے ان کو فریدوں اور افراسیاب کی عظمت کی جانب متوجہ کیا ہوگا۔ اور چونکہ ان مشاہیر کے بعد صدیوں تک ان کا خاندان نمایاں نہ ہو سکا۔ اور تاریخ کی گمنامی اور تاریکی میں کھو کر رہ گیا۔ اس حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرزا نے اپنے خاندان کو ان سے منسلک کر دیا۔ اگر کوئی شخص اس قسم کے فن کا مظاہرہ کرنا چاہے تو وہ گمنامی کی صدیوں کے دوران فرضی ناموں کی فہرست مرتب کر کے سلسلہ قائم کر سکتا ہے لیکن مرزا نے ایسا نہیں کیا۔ اور گمنامی کی صدیوں کے ناموں کو بھی گمنامی ہی میں رہنے دیا۔

مرزا نے خاندانی قلابے ملانے کا جو طریقہ اختیار کیا اس کے متعلق بھی تاریخ شاہد ہے کہ اس فن کے بھی مرزا غالب موجد نہیں بلکہ مقلد ہی سمجھے جا سکتے ہیں کیونکہ جس طرح کسی ضرورت اور

حصول منفعت سے مجبور ہو کر انھوں نے ایسا کیا ہو گا۔ ویسی ہی مجبوریوں سے ان سے بہت بڑے درجے کے لوگ ان سے بہت پہلے اس فن میں مہارت کا ثبوت بہم پہونچا چکے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے بادشاہ بلبن (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) اور کئی دوسرے غلام خاندان کے بادشاہ بھی تھے بلبن التمش کے چالیس ترک غلاموں میں سے ایک تھا۔ رضیہ بیگم کے زمانہ میں اس نے میر شکار کا عہدہ حاصل کیا تھا اور جب اس نے ۱۲۶۶ء میں بادشاہت حاصل کر لی تو اس نے اپنے لئے التمش کا غلام ہونے کی حیثیت کو خاندانی وجاہت کے پردے میں چھپانے کی غرض سے اپنے شجرہ نسب کو افراسیاب سے ملا دیا تھا۔ وہی افراسیاب جس کی اولاد ہونے کے غالب دعویدار رہیں۔ اس طرح دکن میں بہمنی سلطنت کے بانی علاء الدین حسن گنگو بہمنی نے لفظ "بہمنی" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا شجرہ نسب بہمن بن اسفندیار سے جوڑ دیا تھا۔ (تاریخ فرشتہ)

غالب کی تحریروں کے مطابق ان کے دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آئے اور پہلے لاہور میں نواب معین الملک عرف منو کی ملازمت میں رہے۔ جو اس وقت پنجاب کا ناظم تھا۔ (غالب مصنفہ غلام رسول مہر) ۱۷۵۰ء میں معین الملک کے انتقال کے بعد لاہور سے دہلی آئے اور مرزا بخت خاں کے توسط سے ۵۰ گھوڑوں اور نقارہ و نشان کے ساتھ ملازم ہوئے اور پہاسو کا پرگنہ منصب میں دیدیا گیا۔

مرزا غالب نے اپنے نانا خواجہ غلام حسین خاں کی ثروت و جائداد کے متعلق منشی شیو نرائن کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

"ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اس کے دروازوں کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس کے ایک کٹھیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک اور کٹرہ کہ وہ کشمیریوں والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

غالباً اسی خط کی روشنی میں مرزا غالب کے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالی نے

"یادگارِ غالب" میں لکھا ہے کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی آگرہ میں ایک خاصی سرکار تھی جس کی بدولت ان کے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے مالگذار بن گئے۔"

مرزا کے اخلاق و عادات

بچپن ہی میں مرزا کے والد کے انتقال اور پھر چچا کے انتقال کے بعد نانا کی نگرانی میں مرزا کی پرورش ہوئی اور اس طرح نگرانوں کی تبدیلی سے مرزا کی اچھی پرورش نہ ہو سکی اور وہ باقاعدہ تعلیم بھی نہ حاصل کر سکے۔ ابتدا ہی میں مرزا کو متعدد بری عادتیں ہو گئیں وہ شراب نوشی اور قمار بازی میں پھنس گئے اور ساتھ ہی محدود آمدنی ہوتے ہوئے فضول خرچی کا بھی شکار ہوئے اور اس طرح ان پر قرض کا بھی بار ہو گیا۔ ان تمام بری عادتوں کے باوجود کہتے ہیں کہ مرزا کا اخلاق بہت بلند تھا اور وہ اپنے دوستوں اور دیگر لوگوں سے خلوص سے ملتے تھے۔ خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے تھے اور یار باش قسم کے انسان تھے۔ اس سلسلے میں ہم کو صرف روایات پر اعتبار کرنا پڑتا ہے لیکن مرزا کے حالات کے تحت چند ایسے واقعات کا ذکر موجود ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا اپنے حریفوں کا مذاق اڑانے اور ان پر آواز ے کسنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ لوگوں نے چونکہ مرزا کو خوش اخلاق اور بردبار قرار دیا ہے۔ اس لئے مرزا کے اس قسم کے واقعات کو ہم کینہ پروری کہنے سے احتراز کریں گے۔ لیکن اس کو ان کے وقتی منتقمانہ جذبہ کا نتیجہ سمجھنے پر ہر شخص مجبور ہو گا۔

کہنے کو تو مرزا یہ کہتے تھے کہ

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال ‌ ‌ ‌ کہ یہ کہے گا سرِ راہ گذر ہے کیا کہئے

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ان کا محبوب اس قدر ستم ظریف تھا کہ وہ سماعتِ حال کی زحمت سے بچتے ہوئے پرسشِ حال کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا بھی چاہتا تھا اور اس

کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جب کبھی بازار میں اس کا اور مرزا صاحب کا سامنا ہو جاتا تو وہ سرِ بازار پرسشِ حال کر لیتا یہ سمجھ کر کہ مرزا صاحب سرِ بازار اپنی رام کہانی شروع کر لینے سے احتراز کریں گے۔ اور عرضِ مدعا نہ کریں گے بلکہ رسمی الفاظ ادا کر کے خاموش ہو جائیں گے۔ مرزا صاحب نے اس شعر میں اس معیارِ اخلاق کی جانب اشارہ کیا ہے کہ اس دور کے شرفا نفاستِ طبع کے تقاضوں کے تحت سرِ راہ یا بازار میں طویل گفتگو سے پرہیز کرتے تھے لیکن یہ اصول مرزا کا نظریہ تو ہو سکتا ہے لیکن معمول نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ بازار میں گفتگو سے احتراز کرنے کا اصول رکھنے والا سرِ راہ حریفوں پر آوازے کسنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ عملاً مرزا کے اخلاق کا اس واقعہ سے اظہار ہوتا ہے کہ جب شیخ ابراہیم ذوق ان کے مکان کے سامنے راستے سے گذرے تو مرزا نے لہک کر ان پر یہ آوازہ کس دیا کہ

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

یہ اور بات ہے کہ مرزا اپنی اس دریدہ دہنی پر قائم رکھنے کی سکت نہ رکھتے تھے اور ذوق پر کسے گئے آوازے کے اس مصرعے کو ایک غزل کے مقطع کی شکل دے کر بادشاہ کو یوں سنانا پڑا کہ

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اسی طرح مرزا قتیل اور ان کے حامیوں کے ساتھ ادبی مناقشہ میں بھی مرزا غالب نے ایسا سخت رویہ اور ایسا کرخت لب ولہجہ اور ایسی درشت زبان اختیار کی تھی کہ اس کو خوش اخلاقی کہنا اخلاق کی قدروں سے انحراف کرنا ہوگا۔ مرزا غالب نے غیظ و غضب کی شدت میں مرزا قتیل کو بار بار کھتری بچہ لکھا ہے۔ اور اس تمام مناقشے میں نامطبوع الفاظ اور ناپسندیدہ انداز اختیار کیا ہے۔

جن مصنفین نے غالب کو خوش اخلاق لکھا ہے غالباً انھوں نے متذکرہ بالا واقعات ان کے اخلاقی کردار میں شامل نہیں کئے اور مرزا نے اپنے ممدوح حضرات کے ساتھ جو رویہ اور جو انداز اختیار کیا اور جو الفاظ ادا کئے انھیں کو مرزا کے اخلاق کی بنیاد سمجھ لیا گیا۔ اور اس

میں کوئی شک نہیں کہ جن حضرات کی مدح سرائی کر کے غالب نے معاوضے حاصل کئے یا جن لوگوں کی وساطت سے ایسے حضرات تک پہونچ سکے یا جن کی وساطت سے ایسے حضرات تک رسائی کا امکان پایا ان کے ساتھ مرزا نے انتہائی انکسار اور اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے۔ تاہم جن حضرات کی مدح سرائی کر کے وہ کچھ حاصل کر سکتے تھے لیکن مواقع میسر نہ تھے۔ ان کی تضحیک کرنے سے بھی مرزا نے پہلوتہی نہیں کی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں

"میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چلدیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہونچا۔" (یادگار غالب)

ایک اور رئیس کے متعلق فرمایا۔ اسی کے قریب اس کی عمر ہو چکی ہے۔ جب تک میں پہونچوں گا اس کا انتقال ہو چکا ہوگا۔ اور اسی ضمن میں قتیل اور شاہ نصیر کی ہجو بھی کی۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ کو جب غالب کی مالی پریشانی کا علم ہوا تو انھوں نے غالب کو دکن میں راجہ چندولال کی خدمت میں پہنچنے کا مشورہ دیا۔ غالب نے ناسخ کو جو جواب لکھا اس میں یہ لکھا تھا کہ۔

"میں وہاں جا کر کیا کروں گا وہاں تو قتیل اور شاہ نصیر کی استادی کا ڈنکا بج رہا ہے۔ میری معنی آفرینی کو کون پہونچے گا۔ راجہ چندولال کی عمر ۸۰ سے زیادہ ہے۔ جب تک میں وہاں پہونچوں گا وہ مر چکا ہوگا۔"

(متفرقات غالب)

دروغ مصلحت آمیز

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی بلندی اخلاق میں دروغ مصلحت آمیز کو بڑا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ انھوں نے کسی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے سفر رام پور کے دوران کچھ می نمائندگی ماں زند کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ جب وہ سفر کی تیاری کر رہے تھے اور جب سفر پر روانہ ہوئے تو جن لوگوں نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے ان لوگوں کو مختلف جوابات دیئے گئے کسی سے کہیں جانے کا بتایا اور کسی سے کہیں ________

________ لیکن رام پور جانے کا راز کسی کو نہ بتایا۔

جب رام پور جاتے ہوئے دلی سے میرٹھ پہونچ گئے تو وہاں سے غلام نجف خاں کو ایک خط روانہ کیا جس میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"ہاں بھائی میں از روئے مصلحت اپنے کو مختلف مقامات کا عازم کہہ آیا ہوں اب جو شخص تم سے پوچھا کرے اس سے پردہ نہ کرنا اور صاف کہہ دینا کہ رام پور گیا ہے۔" (اردوئے معلی)

آدھا مسلمان

شخصی اخلاق کے اعتبار سے بھی مرزا کی زندگی میں کچھ قابل غور واقعات موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود کو "ہم اسد اللہم وہم اسد اللہیم" کہنے والا کسی مصلحت کی بنا پر خود کو آدھا مسلمان کہنے سے بھی حجاب نہیں کرتا تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں نے مرزا کی پنشن بند کر دی تھی اور مرزا پنشن کو دوبارہ جاری کرانے کے لئے کوشاں تھے اس وقت وہ انگریز حکام سے مل کر ان کی مدح سرائی کرتے تھے۔ ان کی شان میں قصائد پڑھتے تھے اور ان سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پنشن کے دوبارہ جاری ہونے کی سبیل نکالیں۔ اسی سلسلے میں مرزا نے کرنل براؤن سے بھی ملاقات کی۔ جس کا ذکر ان کے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالی نے اس طرح کیا ہے۔

"جب مرزا کرنل براون کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ پاپاخ ان کے سر پر تھی۔ انہوں نے مرزا کی یہ وضع دیکھ کر کہا ویل تم مسلمان: مرزا نے کہا آدھا۔ کرنل نے کہا اس کا کیا مطلب۔ مرزا نے کہا شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ کرنل یہ سن کر ہنسنے لگا۔" (یادگار غالب)

مولانا حالی اور غالب کے کچھ اور مداحوں نے غالب کے اس جواب کو ان کی ظرافت اور خوش طبعی قرار دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی رائے صحیح ہو لیکن جس موقع پر مرزا غالب نے خود کو آدھا مسلمان کہا ہے اس کی مناسبت سے یہ بات قابل غور ہے کہ مرزا نے کس جذبہ سے اور کس مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ بات کہی ہوگی۔ مرزا کرنل براون سے

پنشن کی اجراء کے لئے درخواست کرنے گئے تھے۔ اس کی خوشنودی ضرور پیش نظر رہی ہوگی۔ کرنل براؤن انگریز اور عیسائی تھا۔ جو شراب بھی پیتا ہوگا اور سور بھی کھاتا ہوگا۔ اس سے نصف مماثلت خوشنودی کا سبب بن سکتی تھی۔ کٹر اور کامل مسلمان ہونے سے دستبرداری بھی عیسائی انگریز کو خوش کر سکتی تھی۔ اتنے بہت سے مختلف پہلوؤں کی موجودگی میں اگر اس جواب کو صرف ظریفانہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہوگی۔

اور پھر یہ ایک بار کا مذاق نہ تھا بلکہ ایک سے زیادہ مرتبہ مرزا نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ بھی ان کے شاگرد رشید حالی ہی کی زبان سے سنئے۔

> "غدر کے بعد جب پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی اس وقت پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا مرزا صاحب نے کہا۔ تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر۔ اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔" (یادگارِ غالب)

اس عبارت سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ خود کو نصف مسلمان ظاہر کرنے اور باغی مسلمانوں کے زمرے سے علیحدگی سے مرزا کا مقصد صرف ظرافت کا اظہار تھا یا کچھ اور۔

قید فرنگ

مرزا غالب کی سوانح حیات لکھنے والے بعض حضرات نے مرزا کی سزایابی کو قید فرنگ سے تعبیر کیا ہے اگر کسی سیاسی تحریک یا اقدام کے تحت مرزا صاحب انگریزوں کے اسیر ہوتے تو یقیناً ان کی اسیری کو قید فرنگ کہنا مناسب تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب اخلاقی جرم کے تحت گرفتار کئے گئے تھے۔ ضابطہ فوجداری کے تحت ان کے خلاف عدالتوں میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور عدالتوں سے ان کو سزائے قید کا حکم ہوا تھا۔ یہ واقعہ لال قلعہ میں ملازمت حاصل ہونے سے دو سال قبل کا ہے۔ اس وقت مرزا صاحب مالی طور پر بہت پریشان تھے اور فضول خرچی

بھی ان کی پریشانیوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ بڑھتے ہوئے مصارف کے لئے آمدنی کی سخت ضرورت تھی۔ اور آمدنی کی راہیں مسدود تھیں پھر بھی ضرورتیں اپنے لئے جائز و ناجائز راستے پیدا کر ہی لیتی ہیں۔ اور مرزا صاحب نے بھی ایک ناجائز راستہ نکال لیا تھا۔ اس ناجائز راستے کے لئے انھوں نے اپنی بری عادتوں کا سہارا لیا تھا۔ مرزا صاحب کو ابتدا ہی سے شطرنج اور چوسر وغیرہ کھیلنے کا شوق تھا۔ اور اس شوق کو شرط لگا کر جوے کی شکل دیا کرتے تھے۔ اور اب مالی پریشانی کے دور میں مرزا کچھ تو خود جوا کھیل کر جیتنے کی کوشش کرتے تھے اور کچھ دوسروں کے لئے جوا خانہ قائم کر کے نال میں حاصل کرتے تھے۔ غرضیکہ انھوں نے اپنے گھر کے ایک حصے کو قمار خانہ بنا ڈالا تھا۔ جب تک محمد مرزا خانی شہر کوتوال رہے غالب کھلم کھلا جوا کھلاتے رہے اور ان کا کچھ نہ بگڑا کیونکہ کوتوال ان کا مداح اور دوست تھا۔ اس طرح وہ کوتوال کی دوستی سے فائدہ اٹھاتے رہے لیکن جب محمد مرزا خانی کی جگہ فیض الحسن کوتوال مقرر ہوئے اور انھوں نے انسداد قمار بازی پر زور دیا اس وقت غالب کو خبردار ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ فیض الحسن کوتوال سے ان کے تعلقات نہ تھے۔ اور ان کو خلاف قانون مراعات کی ان سے توقع نہ رکھنی چاہئے تھی۔ لیکن مرزا صاحب خواہ اپنی مالی مجبوری سے خواہ کسی اور وجہ سے قمار خانہ چلاتے ہی رہے اور چاندنی چوک کے جوہریوں کے لڑکے قمار خانے میں جوا کھیلنے آتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیض الحسن کوتوال نے مرزا کو گرفتار کر لیا اور عدالت فوجداری سے مرزا غالب کو چھ ماہ قید بامشقت دو سو روپیہ جرمانہ اور عدم ادائگی جرمانہ میں مزید چھ ماہ قید کا حکم ہوا۔ یہ رعایت بھی دی گئی کہ اگر جرمانہ کے علاوہ پچاس روپئے مزید داخل کردیں تو مشقت موقوف رہے گی عدالت سشن نے بھی یہ سزا بحال رکھی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے جرمانہ اور مزید پچاس روپئے ادا کر کے مرزا کو قید کے دوران مشقت سے بچا لیا۔ اس سے قبل ۱۸۴۱ء میں بھی مرزا غالب کو جوا کھیلنے پر سو روپئے جرمانے کی سزا ہو چکی تھی۔ چاہئے تھا کہ اس سے عبرت حاصل کرتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قید سے بھی ان کے دل میں ندامت کا جذبہ نہ ابھر سکا البتہ اہانت کا احساس ضرور ہوا۔ چنانچہ تفضل حسین خاں کے نام فارسی زبان میں غالب کے

ایک خط کا جو ترجمہ حالی نے "یادگار غالب" میں لکھا ہے۔ اس کے اول تین جملوں سے ندامت نہ ہونے کا اور بقیہ عبارت سے بے عزتی کا احساس ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

"میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں روم ہے۔ مصر ہے۔ ایران ہے۔ بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو۔ خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ۔ آستانہ رحمۃ للعالمین دل دادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ مجھ پر گذرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔"

حالی نے مرزا صاحب کے ایک اور فارسی خط کا جو درج ذیل ترجمہ لکھا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کو قطعی ندامت نہیں ہوئی تھی وہ اپنے فعل پر نادم اور تائب ہونے کی بجائے اپنے اوپر اس کو محافظین قانون کی زیادتی سمجھی ہے۔

" کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی و مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا۔ اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی اغماض و تغافل اختیار کیا۔" (یادگار غالب)

قرض کی پیتے تھے مے

قمار بازی پر سزا و جرمانہ کے واقعات کے علاوہ شراب نوشی نے بھی اس نوبت کو پہونچا یا ہوتا۔ لیکن بال بال بچ

گئے۔ مرزا صاحب ایک انگریز شراب فروش میکفرسن سے ولایتی شراب قرض میں خرید کر پیا کرتے تھے۔ اس انگریز نے قرضہ کی وصولی کے لئے عدالت میں دعویٰ کر کے مرزا کے خلاف ڈھائی سو روپے کی ڈگری حاصل کر لی تھی اور سر راہ عدالت کا چپراسی مرزا کو گرفتار کر کے تھانہ لے گیا لیکن نواب امین الدین خاں نے ڈگری کے تحت اصل وسود ادا کر کے مرزا کو حوالات سے رہائی دلائی۔ اس واقعہ سے بھی مرزا نے عبرت حاصل کرنے کی بجائے اس کو کھلاڑی کی ذہنیت کا رنگ دیا تھا اور فرمایا تھا کہ

قرض کی پیتے تھے مے پر جانتے تھے ہم کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا غالبؔ کی خود ستائی

نعوذ باللہ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ کوئی بری بات ہے لیکن یہ کہا جائے کہ مرزا غالب میں خود نمائی۔ خود پرستی اور خود ستائی کا زبردست جذبہ تھا تو یہ غلط نہ ہوگا۔ غالب کے شاگرد رشید الطاف حسین حالیؔ نے تو ان کے انتقال کے بعد ان کے مرثیے میں غالباً فرطِ عقیدت اور شدت غم سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا تھا کہ قدسیؔ و طالبؔ و اسیرؔ و کلیمؔ۔ لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں۔ ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے۔ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔ کسی کو تو خیر کیا پڑی تھی کہ ان کا منہ کھلواتا لیکن حالی نے بھی پھر کبھی منہ کھولنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور قدسیؔ۔ طالبؔ۔ اسیرؔ۔ یا کلیمؔ کسی کے کلام سے بھی کلامِ غالب کا موازنہ کرکے غالب کی برتری ثابت کرنے کی کوشش نہ کی۔

خیر حالیؔ نے تو متذکرہ بالا چار مسلم الثبوت اساتذہ و شعراء پر ہی غالب کی فوقیت کا دعویٰ کیا لیکن چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں۔ بڑے میاں سبحان اللہ کے بمصداق غالبؔ نے خود اپنے متعلق کہا تھا۔

کوئی مجھ سا نہیں زمانے میں ‏ ‏ شاعر نغز گوئے و خوش گفتار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ‏ ‏ قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

اور بیٹھے بٹھائے ذوق سے الجھ پڑنے میں بھی مرزا کا یہی خود ستائی کا جذبہ کارفرما تھا جبکہ خواہ مخواہ سہرا لکھتے لکھتے ذوق کو کھلا چیلنج دے بیٹھے اور فرمایا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

اور پھر جب ذوق نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے واقعی اس سے بڑھ کر سہرا کہدیا اور اس چیلنج کا یوں جواب دیا کہ

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

تو پھر مرزا کو اپنے کھلے چیلنج کو مقطع کی سخن گسترانہ بات کہہ کر کھلی معذرت ہی کرنی پڑی۔

کیا یہ بھی اسی خود ستائی کے جذبہ کا نتیجہ نہیں ہے کہ میر جیسے اردو کے کامل اور مسلم الثبوت استاد کے فن کا اعتراف کبھی کیا تو براہ راست نہیں بلکہ ناسخ کی آڑ لیتے ہوئے کہ

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور جب بلاواسطہ اعتراف کیا تو اس انداز میں کہ اپنے ہی دور کے شاعر کو مبہم یا غیر مصدق سا ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ریختی کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غرضیکہ مرزا غالب نہ صرف اپنے ہمعصر شعرا کے مقابلہ میں خود کو ممتاز ثابت کرنے کے لیے خود ستائی کرتے تھے بلکہ متقدمین پر بھی اپنی فوقیت ثابت کرنے کے خواہش مند رہتے تھے اور اسی جذبہ کے تحت میر تقی میر کی عظمت تسلیم کرنے میں عجیب عجیب انداز اختیار کیے۔ غالب کو قدیم اساتذہ کی تعریف بھی کسی کی زبان سے سننا گوارا نہ تھا۔ شاید ایسے مواقع پر ان کے دل کی آواز یہ ہوتی رہی ہوگی کہ جو تعریف کسی قدیم استاد کی کی جارہی

ہے وہ خود ان کے حصہ میں ہو جاتی ۔ اس قیاس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو حالی نے بیان کیا ہے ۔ اور جو درج ذیل ہے ۔

" کلکتہ کے قیام کے دوران اثنا گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی ۔ مرزا نے کہا فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے ۔ اس پر بات بڑھی ۔ اس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا ۔ مرزا بولے اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں ۔ مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو ۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا جس کا پہلا شعر یہ ہے

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے ۔ "

اس قطعہ میں سطحی تشبیہات کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ (یادگارِ غالب)

غالب کی خود ستائی کا دوسروں کو بھی اندازہ تھا ۔ اور وہ اخلاق کی حدود میں اور لطیف پیرایہ میں مرزا کو ان کی خود ستائی پر متنبہ بھی کرتے تھے ۔ ورنہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر جیسا سخنور اور سخن فہم ان کی اس انداز میں تعریف ہرگز نہ کرتا ۔ جو صرف ان کی خود ستائی کا جواب معلوم ہوتا ہے ۔ اور جس کا ذکر یوں ہے کہ

" ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ آج حضور (شاہ ظفر) نے ہماری بڑی قدردانی فرمائی ۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا ۔ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ ۔ مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو " (یادگارِ غالب)

تعجب ہے کہ غالب جیسے ذہین شخص نے اس حقیقت کو محسوس نہیں کیا کہ اس

تعریف سے غالب کے جذبۂ خودستائی کو تشنہ رکھنا بلکہ مجروح کرنا مقصود تھا اور بس
ذوق کی پُرگوئی کے مقابلے میں اپنی فارسی دانی پر فخر فرماتے ہیں لیکن اپنی خودستائی میں
حریف کے خلاف بہت ہی نامطبوع رویہ اختیار کیا ہے اور بہت ہی ناپسندیدہ الفاظ
استعمال کئے ہیں۔

لے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن ایں گفتہ	کے بہ پرگوئی فلاں در شعر ہم سنگِ من است
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ	بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگِ من است
در سخن چوں ہم زبان و ہمنوائے من نہ	چوں دلت را ہیچ و تابِ از رشک آہنگ من است
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید	انچہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است

مزید خودستائی فرماتے ہیں۔

راز دارِ خوئے و محرم کردہ اند	خندہ بر دانا و ناداں میز نم
پایۂ من جز بہ چشم من نہ آید در نظر	از بلندی اخترم روشن نہ آید در نظر

شاعرانہ رفعت کے ساتھ خاندانی عظمت کا دعوی بھی فرماتے ہیں۔

سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن	توقیع من بہ سنجر و خاقان برابر است

اب تک غالب کے جس قدر بھی حالات لکھے جا چکے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا
غالب ان لوگوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیا کرتے تھے جن سے
کہ ان کو مالی منفعت حاصل ہوتی تھی یا جن سے ان لوگوں تک پہونچنے کے وسائل
حاصل ہو سکتے تھے۔ بنا بریں جس دلی کے متعلق میر تقی میر کہہ گئے ہیں کہ

دلی کے گلی کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اسی دلی کا ایک شاعر مرزا غالب رامپور کی تعریف ان الفاظ میں کرے کہ

"یہ رامپور ہے۔ دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے"
تو اس کو مبالغہ آرائی اور حصول خوشنودی کی مساعی کے علاوہ اور کیا سمجھا جا سکتا ہے
رامپور کے متعلق متذکرہ بالا سطور غالب کے ایک خط سے لی گئی ہیں جو انھوں

نے میر مہدی مجروح کو لکھا تھا اسی خط میں مزید لکھتے ہیں۔

"سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر ایسا بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے اتنا شیریں کہاں ہوگا"

یہ تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ مبالغہ آرائی شاعرانہ شعار سے بعید ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شعرا نے اس نوع کی مبالغہ آرائی کو اپنایا ہے۔ اور غالب نے بھی اسی مبالغہ آرائی سے کام لے کر کوئی ایسی نئی بات نہیں کی جس کے لئے ان کو مطعون قرار دیا جائے اور نہ یہاں اس حوالہ کا یہ مقصد ہے۔ مقصد تو اس ذکر سے یہ دکھانا ہے کہ مرزا ان لوگوں کو خوش کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے جن سے مالی منفعت حاصل کرتے تھے رام پور کی یہ تعریف اس لئے فرمائی گئی ہے کہ والی رام پور سے غالب کو ایک سو روپئے ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا۔

جس طرح غالب اپنے محسنوں کی تعریف کرتے تھے اسی طرح وہ اپنے شاگردوں سے خود اپنی تعریف سننے کی ہر وقت خواہش رکھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد ان کی ہستی کو ایسا ہی سمجھیں جیسا کہ نظامی نے اپنے استاد فردوسی کو سمجھا اور کہا کہ:-

او نہ استاد بود و ما شاگرد

او خداوند بود و ما بندہ

اور غالب کی یہ خواہش پوری بھی ہوتی تھی جبکہ ان کے تمام شاگردان کی افتاد طبع سے اپنے شعور یا تحت الشعور میں واقفیت رکھتے ہوئے ان کی شان اور ان کی عظمت میں رطب اللسان رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی شاگردوں کے اس جذبہ کو تیز کرنے کی غرض سے غالب اپنے کسی شاگرد کی بھی کچھ تعریف اس انداز میں کر دیتے تھے جیسے بعض رؤسا گلی کوچوں میں لوگوں کو سلام کرتے پھرتے ہیں تاکہ اس کے جواب میں محفلوں میں عوام ان کو سلام کریں۔

ادبی مناقشے

سابق ابواب میں جن متعدد واقعات کا ذکر کیا گیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب میں خودنمائی اور خودستائی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا اور اسی جذبہ کے تحت ادبی مناقشوں میں الجھنا اور اپنے ہمعصر اساتذہ اور اساتذہ سلف کے علم و فن کو خواہ مخواہ چیلنج کرنا بھی ان کی عادت بن گئی تھی اور یہ اسی عادت اور افتاد طبع کا نتیجہ تھا کہ بیٹھے بٹھائے مغل شہزادہ کا سہرا لکھتے ہوئے استاد ذوق کو چیلنج کر بیٹھے تھے۔ اور نتیجے میں ہلکے سے ہلکے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خفت و شرمندگی ضرور اٹھانی پڑی اور بادشاہ کے حضور میں منظوم معذرت نامہ گذراننا پڑا۔ اس واقعہ کو ہم تفصیل کے ساتھ یہاں نہ دہرائیں گے۔ کیونکہ اس کا مجمل ذکر اس سے قبل بھی آچکا ہے اور اس کے علاوہ یہ بہت مشہور واقعہ ہے جو یہاں اعادہ کا محتاج نہیں۔

جس طرح ذوق سے مرزا غالب خواہ مخواہ الجھ پڑے تھے بالکل اسیطرح مرزا نے برہان قاطع پر اعتراضات کر کے ایک بڑا ادبی جھگڑا اکھڑا کر لیا تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں جب بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے رنگون میں نظر بند کر دیا۔ لال قلعہ کی مغلیہ حکومت ختم ہو گئی اور ساتھ ہی لال قلعہ سے غالب کی ملازمت بھی ختم ہوئی۔ اس وقت دستنبو کی تکمیل کے بعد مرزا صاحب کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ اس فرصت کے دور میں مرزا نے برہان قاطع کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کتاب میں

مرزا نے غلطیاں پائیں اور ان غلطیوں کو یکجا کر کے ایک کتاب کی شکل دی اور قاطع برہان کے نام سے شائع کردی جس کا دوسرا اڈیشن درفش کاویانی کے نام سے شائع ہوا۔

اگر مرزا غالب نے برہان قاطع میں کچھ غلطیاں محسوس کی تھیں اور وہ ان غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان پر صحت مند تنقید کر دیتے تو ان کا یہ کام اردو زبان اور اردو ادب کے لئے قابل قدر ہوتا۔ لیکن یہاں بھی مرزا اپنی اسی افتادِ طبع سے مجبور ہو گئے جس کو ہم ان کی خودستائی اور ادبی معرکہ آرائی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے چنانچہ انھوں نے برہان قاطع میں اپنی دانست میں جو غلطیاں ٹھہرائیں ان پر خوب خوب استہزا کیا اور صاحب برہان قاطع پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے میں نہ صرف تلخ و ترش اور دلخراش انداز اختیار کیا بلکہ فحش کلامی پر بھی اتر آئے اور اس مناقشہ کو قتیل اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ اسقدر طول دیا اور اسقدر فرسودگی اور ابتذال تک پہونچایا کہ یہ جھگڑے کسی طرح بھی مصحفی و انشا کے جھگڑوں سے کم نہ رہ گئے۔

اس ادبی جھگڑے کی ابتدا جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس وقت ہوئی جبکہ مرزا غالب نے اپنے فرصت کے اوقات میں برہان قاطع کا مطالعہ کر کے اس کے اغلاط کو نمایاں کیا اور نہایت تلخ انداز اور درشت لب ولہجہ اختیار کیا۔ جس سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے اس کے جواب میں کتابیں شائع کیں۔ اور غالب کو خود ان کے رویہ کا آئینہ دکھایا۔ اور ویسے ہی سخت الفاظ ان لکھنے والوں نے مرزا کے خلاف بھی استعمال کئے جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ

"اور جو سبک الفاظ مرزا صاحب نے صاحبِ برہان کی نسبت استعمال کئے ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت بھی استعمال کئے گئے۔ (یادگارِ غالب)

جب مولانا حالی نے بھی جنھوں نے مرزا غالب کے "حسن اخلاق" کو اجاگر کرنے کے لئے ان کی درشتیِ کلام پر ہمیشہ پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے یہ تسلیم کرلیا کہ سبک الفاظ کے استعمال کی ابتدا خود مرزا نے کی تھی۔ اور جواب میں ان کے خلاف بھی "ویسے ہی" سبک الفاظ استعمال کئے گئے تو پھر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ جس ادبی کام کو مرزا صاحب خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے تھے اس میں انھوں نے سبک الفاظ

استعمال کر کے مناقشہ کھڑا کر دیا۔ اب " غالب کے طرفدار " جس قدر بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ یہ کام درشت لب و لہجہ کے استعمال کا متقضی تھا لوگوں کو مطمئن نہ کر سکیں گے جبکہ اسی صاحب برہان پر جس کو مرزا نے دشنام کا نشانہ اور درشتی کلام کا تختۂ مشق بنایا۔ اسی دور کے ایک ایرانی ادیب نے بھی تنقید کی ہے۔ اس نے بھی صاحب برہان پر گہرے طنز کئے ہیں جو مرزا کی دشنام طرازی پر بھی بھاری ہیں لیکن حد ادب میں ہیں مثال کے طور پر صاحب برہان نے کسی شہر کے متعلق یہ لکھنے کی بجائے کہ وہ کس ملک یا کسی ملک کے کس حصے اور علاقے کا شہر ہے اور کیوں شہرت رکھتا ہے صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا کہ "یہ دنیا کا ایک شہر ہے" اس پر ایرانی محقق نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ واقعی صاحب برہان کو تحقیق میں بڑی زحمت اٹھانی پڑی ہوگی۔ کتنا بڑا اعتراض کیسے لطیف طنز میں ہے۔ کاش مرزا غالب نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہوتا تو اردو کی ایک اچھی خدمت کر گئے ہوتے۔

مرزا کے غلط اعتراضات

لطف کی بات تو یہ ہے کہ جن اعتراضات کی بنیاد پر مرزا غالب نے صاحب برہان کو دشنام تک کا نشانہ بنا ڈالا اور انتہائی برہمی کا اظہار کیا وہ بھی سب صحیح نہیں ہیں یہاں ہم خود مرزا غالب کے اعتراضات پر محاکمہ نہ کریں گے۔ بلکہ ان کے شاگرد الطاف حسین حالی کے محاکمے پر اکتفا کریں گے۔ جن کی تحریر حسب ذیل ہے۔

"اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراضات غلط کئے ہیں خصوصاً لفظ " افسوس " کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے کہ اس کو لفظ عربی الاصل ماخوذ از تاسف " قرار دیا ہے۔ اور اس غلطی کا انھوں نے آخر کار خود بھی اعتراف کیا اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور ممکن ہے کہ اس کے سوا اور بھی کہیں کہیں ان سے غلطی ہوئی ہو" (یادگار غالب)

ان تمام باتوں کے باوجود حالی نے حق شاگردی ادا کرتے ہوئے مرزا صاحب کی اس سلسلے میں جا و بیجا حمایت کی ہے اور اپنی تحریر کو کچھ ایسا انداز اور ایسا رخ دینے کی کوشش کی ہے جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ غالب کو سخت و سست کہنے کا حق تھا لیکن جواب میں دوسرے

کو سخت سست نہ لکھنا چاہئے تھا۔ حالی کی درج ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہ شوخی طبع کے صاحب برہان کا جا بجا خاکہ اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظ نا ملائم بھی غیظ و غضب میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ زیادہ تر اس وجہ سے مخالفت ہوئی۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔" (یادگار غالب)

ماشاءاللہ گویا حالی کے خیال میں۔ خاکہ اڑانے" اور غیظ و غضب میں الفاظ ناملائم استعمال کرنے کا حق صرف غالب کو تھا۔ جواب دینے والوں کو نہیں۔ خود غالب کے نظریہ کے مطابق کہ ______ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

مولانا حالی نے مرزا کی دشنام طرازی کی شانِ نزول کیسی حسین اور کیسی شیریں بیان کی ہے۔ "کہیں کہیں الفاظ نا ملائم بھی غیظ و غضب میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں" اور پھر "مگر یہ صحیح نہیں ہے۔" لکھ کر تو حد کر دی گویا حالی کے خیال میں سبھی لوگ ان کے ہم خیال ہیں اور صرف غالب کو سخت سست کہنے کا حقدار سمجھتے تھے۔ اس سے متاثر ہونے کو تیار نہ تھے۔ حالانکہ یہ صحیح ہے اور بالکل صحیح ہے کہ غالب نے نا ملائم الفاظ کہہ کر نا ملائم الفاظ سنے۔

یہ غالب کی خود پرستی۔ خود ستائی۔ اور درشتیِ کلام نہیں تو اور کیا ہے کہ: "جب کلکتہ میں قیام کے دوران سند میں لوگوں نے قتیل کا نام پیش کیا تو انھوں (غالب) نے سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوالی فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا

(یادگارِ غالب)

غالب نے نہ صرف قتیل کو بلکہ جو بھی ان کی خود پرستی اور عظمت کی اجارہ داری کے ذہنی دعوے کی زد میں آیا نہیں بخشا غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات پر بھی قتیل کے ساتھ برس پڑے۔ شاید اس جذبہ کے تحت کہ انھوں نے فارسی کی لغات کیوں تالیف کی جبکہ یہ اجارہ داری صرف مرزا کی تھی۔ صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:۔

"اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا۔ غور کرو کہ وہ خران تا مخص کیا لکھتے ہیں۔ میں خستہ دورد مند کیا کہتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے۔ اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ ان دونوں پر لعنت کرو۔" (عود ہندی)

گویا غالب کا نظریہ یہ ہوا کہ کسی کو کچھ نہیں آتا اور کسی کو وہ سب کچھ لکھنے کا حق نہ تھا جو کہ اس نے لکھا۔ اس کے برعکس غالب کو سب کچھ آتا تھا۔ اور انہیں کو وہ سب کچھ لکھنے کا حق حاصل تھا جو کہ انھوں نے نہیں لکھا بلکہ دوسرے لکھ گئے تھے۔ اپنی ہمہ دانی کی سندیوں پیش کرتے ہیں۔

"مبدأ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔" (اردوئے معلیٰ)

"فارسی میں مبدأ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط میرے خمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔" (ادبی خطوط غالب)

اب کوئی مرزا سے پوچھتا کہ کیا مبدأ فیاض ان کے علاوہ کسی اور کو یہ سب کچھ بخشنے پر قادر نہ تھا۔ کیا اس نے یہی سب کچھ بلکہ اس سے کچھ زیادہ کسی اور کو نہ دیا ہوگا۔

ازالہ حیثیت عرفی کی نالش

مرزا نے خود ہی دشنام طرازی شروع کی تھی اور جب دشنام کے جواب سخت سست الفاظ سننے پڑے اور دشنام طرازی کے اس کھیل سے اکتا گئے اور زچ ہو گئے تو عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹانے سے نہ رہے۔

مرزا نے ایک فارسی رسالہ کے مولف پر جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا اور فحش (دشنام) سے بھرا تھا ازالہ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ (یادگار غالب)

مثنوی باد مخالف

مرزا غالب نے دوسروں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیے اور نا ملائم الفاظ استعمال کر کے دوسروں کو بھی دلیر کر دیا تاکہ وہ ویسے ہی الفاظ مرزا کے خلاف استعمال کریں۔ کلکتہ میں

قیام کے دوران جب ادبی جھگڑے نے طول کھینچا اور غالب نے یہ محسوس کیا کہ لوگ سوچیں گے کہ چند روز کے لئے کلکتہ تشریف لائے اور وہاں بھی جھگڑے کھڑے کر لئے مصالحت کوشی سے بھی کام لیا اور جس طرح ذوق سے سہرے کے متعلق جھگڑا کر کے معذرت میں قطعہ پیش کیا تھا۔ اس طرح اس جھگڑے کے سلسلے میں ایک ادبی مجلس میں معذرت میں ایک مثنوی پڑھی جو فارسی زبان میں ہے۔ اس مثنوی میں ایسا ہی خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ میں یہاں چند روز کے لئے آیا ہوں میرا مقصد کوئی جھگڑا کھڑا کرنا نہ تھا۔ گویا وہی مقطع میں سخن گسترانہ بات والی ترکیب معذرت یہاں بھی استعمال کی گئی۔ لیکن اس مثنوی میں مصالحت کوشی سے زیادہ حریفوں کے لئے نئے چیلنج بھی ہیں۔ چنانچہ جب مرزا یہ مثنوی پڑھ رہے تھے تو محفل میں کسی نے پوچھا کہ صاحب اس مثنوی کا نام کیا ہے۔ اور مرزا نے جواب دیا "مثنوی باد مخالف" اور فوراً ہی محفل میں کسی نے بلند آواز سے گلستان سعدی کی ایک حکایت کی یہ عبارت پڑھی۔
"یکے از امرا در شکم باد مخالف پیچید"۔ یہاں باد مخالف کے معنی ریاح کے ہیں گویا اس شخص نے شیخ سعدی کا حوالہ دیکر مرزا کی مثنوی باد مخالف کو صحیح معنی پہنا دیئے اور اس طرح مضحکہ اڑایا۔

فرضی استاد عبدالصمد

جیسا کہ مرزا غالب نے سرور کے نام اپنے ایک خط میں کہا ہے کہ "میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں" (یادگار غالب) ان پر بھی لوگوں نے یہی اعتراض کیا تھا کہ وہ بھی ایرانی نہیں ہیں پھر فارسی زبان کے معاملہ میں ان کو کیسے مستند تسلیم کر لیا جائے۔ ان معترضین کو جواب دیتے ہوئے اور اپنی دانست میں ان کے منہ بند کرنے کے لئے مرزا غالب نے من گھڑت سے کام لیا۔ اور ایک ایرانی ملا عبدالصمد کے ہندوستان آنے اور اس کو اپنا مہمان اور اپنا استاد بنانے کی فرضی داستان سنا ڈالی۔ اور

زہر جے اس پر یہ اصرار کہ پینا ہوگا

کے بموجب ان کی شخصیت نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اس من گھڑت کو واقعہ مان لیں کیونکہ کوئی بھی معقول و سنجیدہ انسان یہ شبہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ مرزا غالب کے درجے کا شخص ایسی

فرضی داستان سنائے گا اور وہ بھی زباندانی کے دعوے کے ثبوت میں۔

غلام رسول مہر نے عبدالصمد کے متعلق غالب کے بیان کو اس طرح پیش کیا ہے کہ،۔

جب قاطع برہان کے شائع ہونے پر مناقشہ برپا ہوا تو غالب پر اعتراض کرنے والوں نے یہ بھی اعتراض کیا کہ وہ خود بھی ایرانی نژاد نہیں ہیں اس لئے ان کا زبان دانی کا دعویٰ معتبر نہیں ہو سکتا۔ اس پر انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ میں ملا عبدالصمد کا شاگرد ہوں۔ جو خالص ایرانی تھا۔ وہ پہلے زردشتی مذہب کا پیرو تھا۔ اور اس کا نام ہرمزد تھا۔ اسلام لانیکے بعد اس کا نام عبدالصمد ہوا۔ وہ یزد کا باشندہ تھا اور اس کا سلسلہ نسب ساسان پنجم تک پہونچتا تھا۔ غالب نے اس کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ موحد اور صوفی تھا اور سیاحت کے لئے آگرہ آیا تھا وہ دو سال غالب کے یہاں مہمان رہا۔ جبکہ غالب کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ غالب نے لکھا ہے کہ فارسی زبان کے لطائف وغوامض میں نے اس سے سیکھے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن مفلوج نہ تھا۔ زبان دانی سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دلنشین وخاطرنشاں ہوگئی "۔

فرضی عبدالصمد کو سابق ہرمزد اور ساسان پنجم کی اولاد ظاہر کرنے میں غالب نے جس ذہن رسا اور جس فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی سے غالباً محققین کو یہ شبہ بھی ہوا کہ انھوں نے خود کو بھی افراسیاب و فریدوں تک پہونچانے میں ایسی ہی فنکاری سے کام لیا ہوگا۔

اسی واقعہ کو حالی نے اس طرح بیان کیا ہے۔ " اکابرین فارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا۔ اور اکبرآباد میں میرے مکان پر دو برس رہا۔ اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی معلوم کئے (یادگار غالب)

اس جھگڑے سے قبل ملا عبدالصمد کا مرزا نے کبھی کوئی ذکر نہ کیا تھا کیونکہ من گھڑت کی ضرورت تو جھگڑے کے دوران پیش آئی تھی جس طرح اپنی عظمت بڑھانے کی کوشش میں خود کو ایرانی نژاد شخص کا شاگرد ظاہر کرنے کی غرض سے ملا عبدالصمد کی فرضی داستان سنائی تھی۔ اسی طرح جب خود پرستی نے اپنے لئے شاگردی کو بھی ننگ سمجھا۔ تو پھر ایک فرضی استاد کی شاگردگی کو کیسے گوارا کیا جاتا جس جھگڑے میں فرضی استاد کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ وہ بھی ختم ہوچکا تھا۔ اس لئے

خود مرزا اسداللہ خاں غالب نے اپنی سابقہ غلط بیانی کی تردید اس طرح کردی کہ۔

"مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ حاصل نہیں ملا عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ لوگ مجھ کو بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا (یادگار غالب)

مرزا کی مالی حالت

مرزا غالب کی مالی حالت کے متعلق بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کے اکثر عظیم شعراء کی طرح مرزا بھی مفلوک الحال اور قانع تھے۔ حالانکہ نہ تو وہ مفلوک الحال تھے اور نہ قانع۔ وہ اچھی خاصی خوشحال اور رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے اور جو کچھ حاصل ہوتا تھا اس سے زیادہ کے لئے ہمیشہ ہاتھ پیر مارتے تھے۔ دراصل یہاں ہاتھ پیر مارنا محاورتاً استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ کبھی مرزا نے آزوقۂ حیات حاصل کرنے کے لئے محنت و مشقت یا ہاتھ پاؤں سے کام نہیں لیا بلکہ صرف زبان سے کام نکالتے رہے۔ مدح سرائی کرتے تھے اور معاوضہ وصول کرتے تھے۔ اور چونکہ آمدنی کا یہ ذریعہ غیر متوقع رہتا تھا اور زندگی کا رئیسانہ انداز مستقل تھا اس لئے مرزا زندگی بھر قرضدار بھی رہے۔ والیان ریاست سے مدح سرائی کے معاوضے وصول کرکے وقتاً فوقتاً قرضے ادا بھی کرتے رہے۔ اور کبھی کسی رئیس کو اس پر بھی آمادہ کر لیتے کہ وہ ان کے قرضوں کو ادا کر دے۔ اس طرح مرزا تمام عمر خوشحالی کے ساتھ رئیسانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اچھا کھاتے تھے۔ اچھا پہنتے تھے۔ شراب نوشی بھی پابندی سے کرتے تھے۔ قمار بازی کا شغل بھی فرما لیتے تھے۔ نوکر چاکر خانساماں خادم وغیرہ سبھی ملازم تھے۔ پھر اس کو رئیسانہ زندگی نہیں تو شاعرانہ فلاکت اور قناعت کیسے سمجھ لیا جائے۔

خوراک مرزا کی خوراک کے متعلق ان کے شاگرد رشید حالیؔ نے لکھا ہے کہ

" مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی ۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے ۔ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شوربہ نہیں کھایا ۔ آخر میں ان کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی ۔ صبح کو وہ اکثر شیرہ بادام پیتے تھے ۔ دن کو جو کھانا ان کے گھر سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا ۔ ایک پیالہ میں بوٹیاں اور دوسرے میں لعاب یا شوربا ۔ ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا ایک پیالی میں دو تین پیسہ بھر دہی اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی (یادگار غالب)

کھانے میں جن چیزوں کا ذکر حالی نے کیا ہے وہ روزانہ کسی غریب و مفلس شخص کی خوراک نہیں ہو سکتی بلکہ وہ ایک اچھے اعلیٰ متوسط درجہ کے انسان کی یا کسی رئیس کی خوراک ہو سکتی ہے اور جو مقدار کھانے کی ظاہر کی گئی ہے وہ غالب کے دور انحطاط میں خوراک کی مقدار ہے جو ایک ضعیف بوڑھے شخص کے لئے کسی طرح بھی کم نہیں سمجھی جا سکتی ۔ اس کے علاوہ شراب کا تذکرہ بھی حالی ہی کی زبانی سن لیجئے ۔

" مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی ....

.... اول تو مقدار میں بہت کم پیتے تھے ۔ دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے ۔ جس سے اس کی حدت اور بھی کم ہو جاتی تھی (یادگار غالب)

خود مرزا کی تحریر ملاحظہ کیجئے ۔

" مدت سے میری یہ عادت تھی کہ رات کو فرنچ (فرانسیسی شراب) کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا اور وہ نہ ملتی تو مجھ کو نیند نہ آتی تھی ۔ اگر جواں مرد ۔ خدا دوست ۔ خدا شناس دریا دل مہیش داس ہندوستانی شراب جو رنگ میں فرنچ سے مشابہ اور بو میں اس سے بہتر تھی مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جانبر نہ ہوتا " (دستنبو)

شراب بھیجنے والے کو جوانمرد اور دریا دل کہنا تو خیر اسی فعل کے لئے خدا دوست و خدا شناس کہنا غالب ہی کا حصہ ہے ۔ مرزا کی مالی حالت ضروریات ، مصارف اور وسائل آمدنی کا بڑی حد تک واضح اندازہ ان کی حسب ذیل تحریر سے ہو سکتا ہے ۔

علاء الدین خاں کو ایک خط میں لکھا ہے کہ :۔

"بھائی (امین الدین خاں) سے کہنا۔ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو جا مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگا ؤ چاٹو۔ نہ مول نہ سود اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر بایں ہمہ کبھی خان (نواب الٰہی بخش خاں) نے کچھ دیدیا کبھی الور سے دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگرہ سے کچھ بھیج دیا۔"

مرزا خوش وضع اور خوش پوش تھے۔ ہمیشہ اچھا اور نفیس لباس پہنتے تھے اور قرضداری گوارا کرتے ہوئے بھی رئیسانہ شان نبھاتے تھے۔

"بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔" (یادگار غالب)

رئیسانہ آن کے تحت ہی مرزا ایک سے زیادہ نوکر رکھے ہوئے تھے اور "مرزا نے تنگی و عسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا۔" (یادگار غالب)

نوکروں کی صحیح تعداد گو معلوم نہیں ہو سکی۔ لیکن کم از کم چار نوکروں کی موجودگی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"کلو خانساماں۔ عنایت اللہ خادم اور دو اور ملازم سفر رامپور میں مرزا کے ہمراہ تھے۔"

(یادگار غالب)

نوکروں کو مرزا کیا دیتے تھے اس کا کچھ اندازہ ان کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے نواب صاحب رامپور کو لکھا تھا۔ "۹۳ روپے شاگرد پیشہ کو اور ۲۱ روپے قرض متفرقہ میں جا کر ۹ روپے بچیں گے۔" (مکاتیب)

۹۳ روپے شاگرد پیشہ کے کیا حیثیت رکھتے تھے اس کا اندازہ اس بات کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہئے کہ ایک صدی قبل سکے کی قیمت کیا رہی ہو گی۔ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ یہ ۹۳ روپے شاگرد پیشہ کی ایک ماہ کی تنخواہ نہیں بلکہ کئی ماہ کی ہو۔ کیونکہ جب مرزا صاحب قرض لینے میں ید طولیٰ رکھتے تھے تو یہ بھی بعید نہ تھا کہ ان پر ملازمین کی تنخواہوں کا کئی کئی ماہ کا بقایا رہا ہو

حصولِ زر اور طلب

مرزا نے ہم سب کو یہ پیغام دیا ہے کہ

گر ہے تجھے امیدِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

دراصل یہ مرزا کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے لیکن زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس شخص کو حصولِ زر کے لئے عمر بھر وہ وسائل اختیار کرنے پڑے جن کے متعلق اس کو خود کہنا پڑا کہ۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اوائل عمر ہی میں مرزا کو چچا کی پنشن ملی جس سے گھر بیٹھے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، خرچ کرنے اور اڑانے کا وسیلہ حاصل ہو گیا اور سچ پوچھئے تو اس پنشن نے مرزا میں کوئی کام نہ کرنے اور زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی عادت پیدا کر دی۔ اسی پنشن کی بدولت اوائل عمر میں مرزا نے نہ تو کوئی کام کرنے کی ضرورت سمجھی اور نہ کسی کام کے قابل بنانے کے لئے تعلیم کا کوئی خصوصی انداز اختیار کیا۔ پنشن میں ملنے والی رقم نے بہ فراغت زندگی بسر کرنے کا انتظام کر دیا۔ اور کام کرنے کی ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے مرزا لہو و لعب میں پڑ گئے شراب نوشی اور قمار بازی کے ساتھ شاعری کی طرف بھی راغب ہوئے اور یہی شاعری آخر ان کے کام آئی اور ذریعہ معاش ہی بن گئی۔

لال قلعہ میں چند معززین کی سفارش سے (جس کا ذکر آئندہ آئے گا اس لئے یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے) مرزا غالب اپنی شاعری کی بدولت سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے یہاں ملازم ہو گئے۔ وہ تاریخ لکھنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اس لئے یہ طے پایا کہ تاریخ سے خاص خاص واقعات منتخب کر کے ان کو دیئے جائیں اور وہ ان کو اپنی فارسی عبارت میں تحریر کریں۔ اس کے لئے تنخواہ بھی مقرر ہو گئی جس کا ذکر غالب نے یوں کیا ہے

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اور یہیں سے غالب نے طلب زر شروع کر دی کیونکہ ان میں قناعت بالکل نہ تھی یا ان کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور روز افزوں مصارف نے ان کو قانع نہ بننے دیا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر سے حسنِ طلب ملاحظہ ہو۔ قطعہ

اے شہنشاہ آسمان اورنگ	اے جہاندار آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں	تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی	ہوئی میری وہ گرمی بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچیز	روشناس ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری	ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی	جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں	بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح	تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر	نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں	مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں	ذوقِ آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر	تا نہ دے باد زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش	جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہو کار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گوئے و خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنئے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجئے — ہے قلم میرا ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مرزا غالب نے متذکرہ بالا قطعہ میں اس تنخواہ کی ماہ بماہ ادائگی کے لئے درخواست کی تھی جو لال سے مقرر ہوئی تھی اور ششماہی ادا کی جا رہی تھی۔ یہ تنخواہ ۱۲۶۶ھ میں مقرر ہوئی تھی۔ جبکہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب اور چھ پارچہ کی خلعت عطا کی تھی۔ اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ پر فارسی زبان میں تیموریہ خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد کیا تھا چونکہ مرزا کو تاریخ سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اس لئے یہ طے پایا تھا کہ حکیم احسن اللہ خاں تاریخ کی خاص خاص کتابوں سے

خاندان تیموریہ کے متعلق اہم واقعات منتخب اور اخذ کر کے دیں گے اور مرزا ان کو اپنے الفاظ اور اپنے خاص اسلوب میں تحریر کریں گے۔ یہ سلسلہ بھی زیادہ روز قائم نہ رہا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں جب بہادر شاہ ظفر معزول ہو کر رنگون میں نظر بند ہوئے تو مرزا کی یہ ملازمت بھی جس کے دوران انھوں نے تاریخ کی صرف پہلی جلد "مہر نیم روز" لکھی تھی، ختم ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دو سال تک مرزا غالب سخت مالی مشکلات میں مبتلا رہے۔ علاوہ قرض کے آمدنی کا کوئی دوسرا وسیلہ نہ تھا۔ مالی مشکلات کے اس دور میں بھی مرزا اپنے مصارف میں کمی نہ کر سکے اور نتیجے میں بہت قرضدار ہو گئے لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دو سال بعد ریاست رام پور سے مرزا کا تعلق ہو گیا اور نواب صاحب رامپور نے صرف مدح سرائی کے لئے غالب کو سو روپئے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ بظاہر یہ ریاست رامپور سے مرزا صاحب کی پرورش کا ایک انتظام تھا کیونکہ ان کے لئے رامپور میں قیام کو ضروری نہیں قرار دیا گیا تھا۔ وہ دہلی ہی میں رہتے تھے اور ڈاک کے ذریعہ موصول ہونے والی نواب صاحب رام پور کی غزلوں کی اصلاح کرتے تھے۔ اور موقع بموقع ان کی شان میں قصائد لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ اور معاوضہ میں ریاست رامپور سے سو روپئے ماہوار کی تنخواہ وصول ہو جاتی تھی۔

مرزا غالب نے رامپور سے ملنے والی تنخواہ پر کبھی قناعت نہ کی اور نواب صاحب سے تنخواہ کے علاوہ زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے

چنانچہ ایک موقع پر سو روپئے تنخواہ کے وصول ہونے کے بعد اس طرح مزید رقم طلب کرتے ہیں۔ کہ سو روپئے کی رسید اور مزید رقم کے لئے درخواست کو یکجا کر دیتے ہیں۔

"سو روپئے کی ہنڈوی پہونچی اور روپیہ وصول میں آیا۔ اور صرف ہو گیا اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں اس مشاہرہ مقررہ سے علاوہ دو سو روپئے مجھ کو اور بھیج دیجئے گا تو لیجئے گا لیکن اس شرط سے کہ اس

عطیہ مقررہ میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو (مکاتیب)

سو روپئے کی رقم کے وصول ہوتے ہی اس سے دگنی رقم کے لئے درخواست کردینے سے طلب کرنے والے اور عطا کرنے والے دونوں کی ہمت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اپنے متبنی صاحبزادے باقر علی خاں کی شادی کے مصارف کے لئے دو ڈھائی ہزار کی رقم طلب کرتے ہوئے مقدار کی حد کو غیر متعین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہ رسم نہیں ہے کہ سائل مقدار سوال عرض کرے۔ —————— دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرا حق خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں جو کچھ دو گے اس میں شادی کروں گا۔" (مکاتیب)

دوسرے متبنی صاحبزادے حسین علی خاں کی شادی کے لئے بھی مصارف اور ان کے لئے علیحدہ تنخواہ کا مطالبہ فرمایا

"پیر و مرشد حسین علی خاں کی سسرال والوں کا بڑا تقاضہ ہے۔ زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آئے وہ عطا کیجئے اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجئے۔ یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں۔"

آٹھ سو روپئے کے قرضے کی ادائگی کے لئے امداد کی درخواست بھی کی گئی لکھتے ہیں کہ:

"آٹھ سو روپئے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال کبھی نہ کہوں گا۔ آٹھ سو روپئے مجھ کو اور دیجئے۔ شادی کیسی میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔" (مکاتیب)

نواب صاحب رام پور کے نام ایک اور خط میں حسن طلب ملاحظہ ہو:

"بار گراں سے پست ہو گیا ہوں۔ آگے تنگ دست تھا اب تہی دست ہو گیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجئے اور کچھ بھجوا دیجئے۔"

والی رام پور کے نام ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"عالم الغیب جانتا ہے جس طرح گذرتی ہے۔ چار سو کا قرض باقی ہے اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔" (مکاتیب)

اور پھر درج ذیل خط کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب رام پور کی جانب سے مرزا غالب کے قرضے کی ادائگی کے بعد کا یہ خط ہے۔ بڑے قرضے کی ادائگی کے بعد ہی قرضوں ہی کے حوالے پر طلب کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

"ان دنوں متفرقات کے قرضدار سرگرم تقاضہ بلکہ آمادہ شور و غوغا ہیں۔ دو سو روپے کی ہنڈی صراحی آب حیات ہو گئی۔ دام مرگ سے نجات ہو گئی۔"

ایک اور خط کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

"میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقیماندہ ادا ہو جائے اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ رہے۔"

ماضی۔ حال اور مستقبل تک دامانِ طلب کی وسعت ملاحظہ کیجئے! اور داد دیجئے! کہاں تک اقتباسات کے حوالے دیئے جائیں۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب نے گویا قسم کھالی تھی کہ تمام ضروریات نواب صاحب رام پور ہی سے پوری کرائیں گے اور والیٔ رام پور بھی طے کر چکے تھے کہ ہر طلب پوری کرکے رہیں گے۔ چنانچہ پتہ چلتا ہے کہ والیٔ رام پور نے مرزا غالب کے وہ تمام قرضے ادا کئے جن کے لئے مرزا نے وقتاً فوقتاً درخواست کی اور جو کچھ بھی مرزا نے طلب کیا وہ عطا کیا۔ جیر جوئندہ یابندہ۔

جہاں تک طلب زر کا تعلق ہے مرزا غالب نے چھوٹے چھوٹے مواقع بھی کبھی نہیں کھوئے چنانچہ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں مختصر قیام کیا تھا جس کے متعلق اپنی ایک غزل میں یہ شعر بھی کہا کہ:۔

لکھنؤ جانے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوسِ سیر و تماشہ سو وہ کم ہے ہم کو

غالباً جس طرح مرزا نے اپنے سفر رام پور کو صیغۂ راز میں رکھا تھا اسی طرح لکھنؤ پہونچنے کے مقصد کو بھی پوشیدہ رکھا اور پردہ داری کے استحکام کے لئے متذکرہ بالا شعر بھی کہہ دیا۔

حالانکہ ان کے لکھنؤ جانے کا سبب واضح اور صاف ہے اور وہ یہ کہ وہاں انھوں نے اودھ کے نائب السلطنت روشن الدولہ سے ملاقات کی۔ غالبًا کسی نے ان سے ملنے کا مشورہ دیا ہوگا۔ اور روشن الدولہ سے ان کی سفارش بھی کی گئی کیونکہ یہ فیصلہ بھی عجلت میں ہی کیا گیا۔ اور اسی عجلت میں مرزا غالب روشن الدولہ کو پیش کرنے کے لئے قصیدہ بھی تیار نہ کرسکے تھے۔ اور ان کی خدمت میں منثور مدح پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن نثر پیش کرنے کا موقع بھی میسر نہ ہوا کیونکہ باریابی کے لئے روشن الدولہ نے مرزا کی شرطیں منظور نہیں کیں۔

یہ واقعہ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں تحریر کیا ہے۔

لیکن مرزا نے اس در سے بھی کچھ نہ کچھ لے کر ہی ٹلنے کی ٹھان لی تھی اور شاخ ہاتھوں میں نہ آنے پر جڑ کو پکڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ جب کلکتہ سے دلی واپس آ گئے اس وقت نائب السلطنت روشن الدولہ کی بجائے خود والی اودھ نصیر الدین حیدر تک رسائی کی کوشش کی تھی اور ایک قصیدہ دلی سے نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھ کر ایک دوست کے توسط سے گذرانا تھا اور اس پر نصیر الدین حیدر نے پانچ ہزار روپئے بطور صلہ دیئے جانے کا حکم دیا تھا

مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ:۔

"شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار روپئے ملے تھے تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے۔ دو ہزار متوسط کو دیکر کہا اس میں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیجدو۔ مرزا صاحب نے یہ سن کر جواب تحریر کیا مگر تین دن بعد یہ خبر پہونچی کہ نصیر الدین حیدر مر گئے۔" (یادگارِ غالب)

پانچ ہزار روپئے کے صلے سے اس طرح محرومی اور نصیر الدین حیدر کے انتقال کا واقعہ بھی مرزا کی طلب کو زک نہ دے سکا اور مرزا نے برابر کوشش جاری رکھی۔ سفارشات پہونچائیں اور عرضداشتیں اور قصیدے بھیجے جس پر والی اودھ واجد علی شاہ نے مرزا غالب کے لئے پانچسو روپئے سالانہ مقرر کر دیئے اس طرح مرزا اپنے عزم طلب میں پورے اترے اور اس در سے بھی کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لیکر ہی ٹلے یہ اور بات ہے کہ صرف دو برس گذرے تھے کہ واجد علی شاہ معزول کر دیئے گئے ریاست ضبط ہوگئی اور مرزا کے لئے وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔

موقع پرستی

مرزا غالب کی ذہانت و طباعی کی ایک یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ انھوں نے کبھی کسی اچھے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اگر کسی اچھے وسیلے کو وہ اپنا نہیں سکے تو کم از کم اس کے حصول کے لئے کوشش ضرور کی۔ مثال کے طور پر دربار اودھ سے تعلق کے معاملے کو لے لیجئے۔ کلکتہ جاتے ہوئے مرزا نے اودھ کے نائب السلطنت نواب روشن الدولہ تک رسائی کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس ناکامی نے موقع سے فائدہ اٹھانے کے جذبے کو کچلا نہیں اور جب مرزا کلکتہ سے دلی واپس آگئے تو انھوں نے پھر دربار اودھ سے تعلق قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس واقعہ سے ان کی بلند آہنگی کا اظہار ہوتا ہے کہ نائب السلطنت تک نہ پہنچ سکنے کے بعد اس مرتبہ انھوں نے براہ راست والی اودھ شاہ نصیر الدین حیدر تک رسائی کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیابی حاصل کرکے رہے اور پھر آخر کار نواب واجد علی شاہ والی اودھ کے دور میں دربار اودھ سے پانچسو روپئے سالانہ کا وظیفہ حاصل کرلیا۔ بہر صورت خواہ لال قلعہ کی مصاحبت و ملازمت ہو خواہ دربار رامپور سے تعلق اور چاہے نواب اودھ سے لگاؤ۔ مرزا کی ذہانت نے ان کو ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی ہمیشہ ترغیب دی۔ مرزا موقع پرستی کے اصول پر ہمیشہ کاربند رہے اور اس طرح کہ جب تک کسی وسیلے سے فائدہ حاصل ہوتا رہا وہ اسی کو سب کچھ سمجھتے رہے اور جیسے ہی اس کی افادیت ختم ہوئی مرزا نے بھی اس کو نقش و نگارِ طاقِ نسیاں بنادیا۔

لال قلعہ کی سیاست

لال قلعہ میں مرزا اسداللہ خاں غالب کی رسائی اول اول اکبر شاہ ثانی کے دور میں ہوئی لیکن یہ رسائی صرف اس حد تک تھی کہ مرزا لال قلعہ کی خاص خاص تقریبات میں شرکت کر لیتے تھے ان کو نہ تو بادشاہ کی مصاحبت و ملازمت کا فخر حاصل تھا اور نہ دربار سے ان کا کوئی باضابطہ تعلق تھا۔ لیکن اسی زمانہ میں لال قلعہ میں سیاست کی کچھ ایسی بساط بچھی ہوئی تھی جو غالب کی موقع پرست ذہنیت کے لئے خوانِ یغما ثابت ہوئی اور یقیناً اسی سیاست نے مرزا غالب کے لئے لال قلعہ میں روز افزوں دلچسپیاں پیدا کر دی ہوں گی۔ چنانچہ اسی سیاست کے طفیل مرزا صاحب نے رفتہ رفتہ اکبر شاہ ثانی کی مصاحبت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ سیاست یہ تھی کہ انگریز سراج الدین محمد کو ولیعہد بنانے پر مصر تھا۔ اور اکبر شاہ ثانی اس کوشش میں تھے کہ شہزادہ سراج الدین محمد کو نظر انداز کر کے شہزادہ سلیم کو ولیعہد مقرر کیا جائے انگریزوں اور اکبر شاہ ثانی کے درمیان اس اختلاف کے نتیجہ میں لال میں جو سیاست چل رہی تھی اس نے غالب کے لئے موقع پرستی سے فائدہ اٹھانے اور بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کا ایک اچھا ماحول پیدا کر دیا تھا۔

اس سیاسی کشمکش میں مرزا غالب وقت ضائع کئے بغیر اکبر شاہ ثانی کے حامی اور ہمنوا ہو گئے کیونکہ ان کو نہ تو سراج الدین محمد سے جو بعد میں بہادر شاہ ظفر ہوئے کوئی تعلق پیدا ہو سکا تھا اور نہ کوئی توقع تھی کیونکہ استاد ذوق سراج الدین محمد کے استاد تھے۔ اور وہی ان کے مزاج میں دخیل تھے۔ چنانچہ مرزا غالب ایک طرف تو سراج الدین محمد تک رسائی سے مایوس تھے۔ اور دوسری طرف امید کی کرن نظر آ رہی تھی کہ اکبر شاہ ثانی کی کوششوں سے آئندہ بادشاہ شاہزادہ سلیم ہو سکتے ہیں اور ان تک رسائی مستقبل میں غالب کے لئے عروج کا باعث بن سکتی تھی۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے مرزا صاحب نے کھلم کھلا شہزادہ سلیم کی طرفداری شروع کر دی تھی۔ اور گویا اس طرح لال قلعہ کی سیاست کے ایک فریق کی تحریکوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ اسی اثنا میں مرزا غالب نے

اکبر شاہ ثانی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اس میں شاہزادہ سلیم کی مدح بھی شامل کی، اس قصیدے کا ایک شعر یہ ہے۔

زہے مناسبت طبع شاہزادہ سلیم
بہ فیض تربیت بادشاہ ہفت اقلیم

اکبر شاہ ثانی کی انتہائی کوششوں کے باوجود شہزادہ سلیم ولیعہد نہ ہو سکے اور انگریزوں نے سراج الدین محمد ہی کو ولیعہد مقرر کیا۔

بہادر شاہ کی مدح سرائی

جب موقع اس بات کا مقتضی تھا کہ سراج الدین محمد کی مخالفت اور شہزادہ سلیم کی مدح سرائی کی جائے تو غالب نے ویسا ہی کیا تھا لیکن جب سراج الدین محمد ولیعہد مقرر ہو گئے تو غالب کی موقع پرست طبیعت نے فوراً شہزادہ سلیم سے قطع نظر کر کے سراج الدین محمد کی مدح سرائی شروع کر دی۔ متعدد اشعار میں اپنے سابقہ رویہ پر اظہار ندامت کرتے ہوئے معذرت بھی طلب کی۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی باریاب ہوئے اور بہادر شاہ ظفر کی مخالفت اس انداز کی مدح سرائی میں تبدیل ہوئی کہ بادشاہ کی غلامی شرف بن گئی۔

کیا کم شرف یہ ہے کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و عزت و حشمت نہیں مجھے

دوسرا مصرعہ بادشاہ سے طلب و تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ظفر سے وابستگی کی انتہا

بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب کے سابقہ مخالفانہ رویہ کو نظر انداز کر کے ان پر مراحم خسروانہ فرمائے اور ۱۲۶۶ھ میں ان کو پچاس روپئے ماہوار کی ملازمت بھی دی جس کا ذکر مرزا نے یوں کیا ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

٭ جمعرات کے دن ۲۲ شعبان ۱۲۶۶ھ (۴ جولائی ۱۸۵۰ء) کو بادشاہ کے حضور میں

باریابی حاصل ہوئی خلعت شش پارچہ ملازمان درگاہ نے پہلے سے پہنا دیا تھا۔ بادشاہ نے دست خاص سے جیغہ اور سرپیچ سر پر باندھا۔ اور مالائے مروارید گلے میں ڈالی۔ اور نجم الدولہ۔ دبیر الملک۔ نظام جنگ خطاب عطا کیا۔ خدمت یہ قرار پائی کہ حکیم احسن اللہ خاں تاریخوں سے واقعات چن چن کر دیتے رہیں اور اپنی طرزِ خاص میں ان واقعات کو لکھوں اور خدمت کے صلے میں پچاس روپے ماہوار مقرر کئے گئے۔"

اس واقعہ کے تقریباً چار سال بعد ۱۸۵۴ء میں جب استاد ذوق کا انتقال ہوا تو بہادر شاہ ظفر نے اپنے اشعار کی اصلاح کی خدمت بھی مرزا غالب کے سپرد کر دی۔

بادشاہ کی توجہ اور مراحم خسروانہ کا اعتراف مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے۔

"بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی۔ ناظر۔ حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔" (اردوئے معلیٰ)

ظفر سے انحراف

وہی بادشاہ جس کے متعلق خود یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ فرزندوں کے برابر پیار کرتا تھا۔ جب ۱۸۵۷ء میں نظر بند کر کے رنگون بھیج دیا گیا تو غالب نے اس کے ساتھ اپنے تعلق کو یکسر فراموش کر دیا۔ اور موقع پرستی کی روشنی میں آگے بڑھنے لگے۔ بہادر شاہ ظفر کے دیئے ہوئے خطابات کے ساتھ اپنے نام کی جو مہر بنوائی تھی اور جس کو خطوط وغیرہ میں بھی استعمال کرتے تھے مرزا نے اس کا استعمال قطعی ترک کر دیا۔ اور تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اجزاء خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔" (اردوئے معلیٰ)

جس تعلق میں باپ بیٹے کی محبت کے احساس کا اظہار کیا تھا اس کے ختم ہونے پر اس کی حیثیت اس طرح بیان کی۔

"بہادر شاہ سے اس سے زیادہ تعلق نہ تھا کہ سات آٹھ سال تک سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنی سپرد کی اور دو تین سال اصلاح اشعار کرتا رہا۔"

انگریزوں سے وفاداری

عجیب بات یہ ہے کہ دورِ حاضر کے کمیونسٹ غالب کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ غالب نے سوشلسٹ نظریہ اپنایا تھا۔ سوشلسٹ اصول اختیار کئے تھے اور وہ اپنے دور کے ایک سچے کمیونسٹ تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالب ملوکیت پرست اور سرمایہ دارانہ نظام کے حامی تھے۔ بادشاہ اور والیان ریاست کا قرب حاصل کرنا اپنی معراج سمجھتے تھے۔ صاحبان اقتدار کی مصاحبت کو اپنے لئے باعث فخر جانتے تھے۔ بادشاہ انگریز اور سرمایہ داروں کی خوشامد اور ان کی مدح سرائی کر کے ان سے مالی منفعت اور تقرب حاصل کرنا مرزا کا سیاسی۔ اقتصادی اور سماجی و تمدنی نصب العین تھا موقع پرستی ان کا مسلک تھا۔ خود چڑھتے سورج کی پوجا کرتے تھے۔ اور اپنے سے کمتر درجہ کے لوگوں سے خوشامد کرانے کے خواہش مند رہتے تھے۔ چڑھتے سورج کی پرستش اور موقع پرستی کا یہ عالم تھا کہ جب قلعۂ معلیٰ میں رسائی حاصل ہوئی تو خوشی سے پھولے نہ سمائے اور دلی کے بادشاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ لال قلعہ کی دیواروں تک محدود مملکت کے بادشاہ کے سرداروں کی صف میں طغرل و سنجر کو لا کھڑا کیا۔ سکندر اور دارا کو بادشاہ بے ملک کا چاکر بنا دیا۔ چاند کو بادشاہ کا مجرئی قرار دیا اور طنز کی حدود کو چھونے والی مبالغہ آرائیوں کے معاوضے میں بادشاہ سے آذوقہ حیات حاصل کرتے رہے لیکن جب بادشاہ بالکل بے دست و پا ہو گیا اور انگریزوں نے اس کو رنگون میں نظر بند کر کے خود اپنا اقتدار و تسلط قائم کیا تو غالب نے نہ تو اپنے آقائے ولی نعمت بہادر شاہ ظفر کی بے مائگی و مجبوری کا ماتم کیا نہ ان کے حال زار پر افسوس کیا بلکہ ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر ادھر سے منہ موڑ لیا اور انگریز حکام کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور ان کی مدح سرائی میں رطب اللسان ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (غدر) کے بعد مرزا نے والی رامپور کو ایک خط میں جو فارسی زبان میں تحریر کیا تھا کھل کر انگریزوں کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ ہمیشہ سے انگریزوں کے وفادار رہے اور ہمیشہ رہیں گے۔

بہادر شاہ ظفر کی ملازمت میں رہتے ہوئے بھی مرزا غالب انگریز حکام کی مدح سرائی سے غافل نہ رہے اور مسلسل ناکامیوں اور مایوسیوں کے باوجود انہیں کا گاتے رہے اور پنشن کی درخواستیں گذارتے رہے۔ ان کے علاوہ مختلف ریاستوں سے بھی کچھ نہ کچھ حاصل کرتے اور کچھ نہ کچھ والیان ریاست کی مدح سرائی کرتے رہے۔ غرضیکہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتے رہے اور غالباً یہ نہ سوچتے ہوئے کہ کہاں سے لینا چاہئے کہاں سے نہیں۔ جہاں سے بھی جو کچھ بھی ملا لیتے رہے اور ہل من مزید کا نعرہ بلند کرتے رہے۔

غالباً یہ چومکھی سیاست یا موقع پرستی بھی غالب کی اپنی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہ تھی بلکہ ان کو ترکہ میں ملی تھی جبکہ غالب کے دادا الور کی ریاست میں ملازم تھے۔ چچا مرہٹوں کے یہاں نوکر تھے اور بعد میں لارڈ لیک کی خدمت میں رہ کر خود جاگیر حاصل کی اور اولاد کو وظیفہ کا مستحق بنا دیا اور غالب کی بیوی کے چچا انگریزوں کے بڑے دوست اور رفیق تھے۔ اس ماحول کا نقشہ علیگڈھ یونیورسٹی کے خورشید الاسلام صاحب نے اپنی کتاب "غالب" میں اس طرح کھینچا ہے۔

"غالب نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ دلی اور آگرہ کے چند معزز خاندانوں میں سے تھا۔ یہ خاندان عام انسانوں کے مقابلہ میں بادشاہوں اور ان کے خاندانی معاملوں، منصب داروں اور ان کی سازشوں، مرہٹوں، روہیلوں، نوابین اودھ اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کی باہمی رقابتوں یعنی شیطان کے غموں سے زیادہ آشنا تھا۔ .... غالب مغلوں مرہٹوں اور انگریزوں کی مربیانہ توجہ سے بالواسطہ فیضیاب رہے۔ غالباً ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہوگی کہ مغل بادشاہ ہے اور نہیں بھی۔ مرہٹہ مغلوں کا نائب ہے اور حاکم بھی۔ انگریز مسلمان نہیں۔ ہندو نہیں لیکن دہلی پر حکومت کرتا ہے اور میرے بزرگ ہر طاقت کے ساتھ ہیں۔ اور سچ پوچھو تو کسی کے ساتھ بھی نہیں "

کلامِ غالب

اردو کے اور بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح مرزا غالب کے کلام میں بھی کہیں میر اور درد کا رنگ ہے۔ کہیں سودا کا انداز لیکن زیادہ اثر ان کی شاعری پر ناسخ کا نظر آتا ہے۔ مرزا غالب کے حسب ذیل اشعار میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے کلام کی طرح گہرے تاثرات تپش۔ سوز۔ خلش۔ بیتابی اور برجستگی کے حامل ہیں۔

میر درد کے رنگ میں

وحشی بن صیاد نے ہم غمخواروں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاک جیب دریدہ صرف قماشِ دام کیا

عکسِ رخ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ
شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا

ساقی نے ان بہر گریباں چاکیِ موجِ بادہ ناب
تارِ نگاہِ سوزن مینا رشتۂ خطِ جام کیا

مہر بجائے نامہ لگائی بر لب پیکِ نامہ رساں
قاتل تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسد
ماہ کو در تسبیح کواکب جائے نشیں امام کیا

درسِ تپش ہے برق کو اب ان کے نام سے
وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

آئینہ دیکھ اپنا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا — بیکسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ظلم کر نا گدا اے عاشق پر — نہیں شاہان حسن کا دستور

زندگانی پہ اعتماد غلط — ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے — دشمنی ہے وصال کا مذکور

یارب یہ دردمند ہے کس کی نگاہ کا — ہے ربطِ مشک و داغ سوادِ ختن ہنوز

میں ہوں سراب یک تپش آموختن ہنوز — زخمِ جگر ہے تشنۂ لب دوختن ہنوز

فانوس شمع ہے کفن کشتگانِ شوق — در پردہ ہے معاملۂ سوختن ہنوز

بے لالہ عارضاں مجھے گلگشتِ باغ میں — دیتی ہے گرمیِ گل و بلبل ہزار داغ

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے — سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

سودائے عشق سے دمِ سرد کشیدہ ہوں — شامِ خیالِ زلف سے صبحِ دمیدہ ہوں

کی متصل ستارہ شماری میں عمر صرف
تسبیحِ اشک ہائے ز مژگاں چکیدہ ہوں

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتے ہیں رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزاو ایماں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

یوں ہی کچھ بات ہے جو میں چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

مرزا رفیع السودا کے انداز میں مرزا غالب کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

سودا کا انداز

جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر
ہر سو سواد جلوۂ مژگانِ حور تھا
اے وائے غفلتِ نگہ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہ طور تھا

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوہ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
نظارہ کیا حریف ہوا برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

جو اعتماد نامہ و خط کا ہو مہر سے
یوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبار داغ

درس عنوان تماشہ بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے
ہے غرض جوہر خط و خال ہزار عکس
لیکن ہنوز دامنِ آئینہ پاک ہے
ہوں خلوتِ فسردگی انتظار میں
وہ بے دماغ جس کو ہوس بھی تپاک ہے

یہ کام دل کریں کس طرح گرہاں فریاد
ہوئی ہے لغزشِ پا لکنتِ زباں فریاد
نوازشِ نفسِ آشنا کہاں ورنہ
برنگِ نے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد

کیا دے صدا کہ الفتِ گم گشتگاں سے آہ
ہے سرمہ گرد رہ بہ گلوئے جرس تمام
اے بال اضطراب کہاں تک فسردگی
یک پر زدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام

رہتے ہیں افسردگی سے سخت بیدردانہ ہم
شعلہ ہا اندر سمندر بلکہ آتش خانہ ہم

وحشتِ بے ربطی پیچ و خم ہستی نہ پوچھ
ننگ بالیدن ہیں جوں موئے سرِ دیوانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

تا چند نفس غفلتِ ہستی سے بر آوے
قاصد تپشِ نالہ سے یارب خبر آوے

ہے طاقِ فراموشی سودائے دو عالم
وہ سنگ کہ گلدستۂ جوشِ شرر آوے

لے ہرزہ روی منتِ تمکینِ جنوں کھینچ
تا آبلہ محمل کشِ موجِ گہر آوے

وہ تشنۂ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بہ کیفیتِ ساغر نظر آوے

مرزا غالب کے زیادہ تر اشعار اسی ساخت کے ہیں جو ناسخ کے کلام کی ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے درج ہیں۔

ناسخ کی روش میں

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

اسیرِ بے زباں ہوں کاشکے صیادِ بے پروا
بہ دامِ جوہرِ آئینہ ہو جائے شکار اپنا

دریغ اے ناتوانی ورنہ ہم ضبط آشنایاں نے
طلسمِ رنگ میں باندھا تھا عہدِ استوار اپنا

اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بیتابی
نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

شمع بجھتی ہے تو اس میں دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق　　ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

شیشۂ آتشیِ رخ پر نور　　عرق از خط کشیدہ روغنِ مور
بسکہ ہوں بعدِ مرگ بھی نگراں　　مردمک سے ہے خالی برلبِ گور

بیگانۂ وفا ہے ہوائے چمن ہنوز　　وہ سبزہ سنگ پر نہ اگا کوہکن ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر　　ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

ہوتے ہیں نیست جلوۂ خور سے ستارگان　　دیکھ اس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

حسرتِ عرضِ تمنا یاں سے سمجھا چاہئے　　دو جہاں حشرِ زبانِ خشک ہیں جوں شانہ ہم
کشتیِ عالم بہ طوفانِ تغافل دے کہ ہیں　　عالمِ آب گداز جوہرِ افسانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں　　ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال　　ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

یاں فلاخن بازِ کس کا نالۂ بیباک ہے　　جادہ تا کہسار موئے چینیِ افلاک ہے
عیش گرمِ اضطراب و اہلِ غفلت سرد مہر　　دورِ ساغر یک گلستاں برگریزِ تاک ہے
عرضِ وحشت پر ہے نازِ ناتوانی ہائے دل　　شعلۂ بے پردہ چینیِ دامنِ خاشاک ہے

مستعدِ قتلِ یک عالم ہے جلادِ فلک　　کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے
ہو جہاں وہ ساقیِ خورشید رو مجلس فروز　　واں اسدؔ تارِ شعاعِ مہر خطِ جام ہے

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

خوابِ جمعیت مخمل ہے پریشاں مجھ سے
رگِ بستر کو ملی شوخیِ مژگاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

کنجِ تاریک و کمین گیریِ اختر شمری
عینکِ چشم تھا ہر روزنِ زنداں مجھ سے

اے تسلی ہوس وعدہ فریب افسوں ہے
ورنہ کیا ہو نہ سکے نالہ بہ ساماں مجھ سے

مرزا غالب کے کلام میں جہاں میر کا رنگ خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ مرزا کی اکثر وہی غزلیں ہیں جو کہ انھوں نے میر کی زمینوں میں کہی ہیں۔ یہی صورت سودا۔ درد اور دیگر شعرا کے انداز کے متعلق بھی نظر آتی ہے۔

صاحبِ طرز

اس طرح مرزا غالب کا کلام میر۔ سودا۔ ناسخ وغیرہ صاحبانِ طرز شعراء کی پیروی پر مشتمل نظر آتا ہے۔ ہاں غالب کے ان اشعار کو جو معنوی حیثیت میں نہیں بلکہ تشکیلی اور اشتقاقی انداز میں سب سے مختلف معلوم ہوتے ہیں ایک مختلف طرز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ غالب کے یہ اشعار اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے سمجھے جا سکتے ہیں یا پھر ایسے فارسی اشعار معلوم ہوتے ہیں جن کو صرف دو ایک الفاظ کے رد و بدل سے اردو کا شعر بنا لیا گیا ہو اسی سلسلے میں کسی کا ایک شعر ذہن میں آگیا ہے جو کسی تبدیلی و ترمیم اور کسی تصحیف و تحریف کے بغیر اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شعر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے

قیامت اے دل ناشاد کر دی
متاعِ زندگی برباد کر دی

"کر دی" اتفاق سے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ماضی مطلق واحد حاضر کا صیغہ ہے بالکل اسی صفت اور اسی ساخت کا مرزا غالب کا بھی حسب ذیل شعر ہے جس کو چاہے اردو کا شعر سمجھ لیا جائے۔ چاہے فارسی کا۔

شیشۂ آتشی رخِ پرنور ؎ عرق از خط چکیدہ روغنِ مور

بالکل یہی کیفیت مرزا غالب کے اس شعر کی ہے۔

اے شہنشاہ آسماں اورنگ اے جہاندار آفتاب آثار

کچھ اسی نوعیت کے حسب ذیل اشعار بھی ہیں:۔

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی : مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین وہوش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

وحشتِ بے لطفی پیچ و خم ہستی نہ پوچھ ننگ بالیدن میں جوں موئے سر دیوانہ ہم

کوشش ہمہ بے تاب تردد شکنی ہے صد رجنبش دل یک مژہ برہم زدنی ہے

رامش گر اسباب فنا نالۂ زنجیر عیش ابد از خویش بروں تاختنی ہے

از بسکہ ہے بجو بر چمن تکیہ زدنہا گلبرگ پہ بالشِ سر رچمنی ہے

آئینہ و شانہ ہمہ دست و ہمہ زانو اے حسن مگر حسرت پیماں شکنی ہے

فانوس شمع ہے کفن کشتگان شوق در پردہ ہے معاملۂ سوختن ہنوز

اے شعلہ فرصتے کہ سویداے دل سے ہوں کشت سپند صد جگر اندوختن ہنوز

مجنوں فسونِ شعلہ خرامی فسانہ ہے ہے شمع جادہ داغ نیفروختن ہنوز

ربط یک شیرازہ وحشت ہیں اجزار بہار سبزہ بیگانہ۔ صبا آوارہ۔ گل ناآشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانہ نیرنگ ہے گردش مجنوں بہ چشمکہائے لیلا آشنا

یہ صفت تو لسانی مرزا غالب کے پورے کلام پر کم وبیش مسلط ہے اور اگر اس کو طرز قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر مرزا غالب بھی صاحب طرز قرار پا سکتے ہیں۔

میر اور غالب

اس عنوان کے تحت ہم میر اور غالب کا موازنہ نہیں کر رہے ہیں کیونکہ اردو شاعری میں میر تقی میر کا جو منفرد مقام ہے وہ کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہیں ہو سکا۔ اور اس طرح میر سے کسی

شاعر کے موازنہ کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں ہم مرزا غالب کے ان اشعار کا ذکر کریں گے جن میں میرؔ کے اشعار سے معنوی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس تقابل میں یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ اکثر مضامین جو مرزا غالب کے اشعار میں کم و بیش یکسانیت لئے ہوئے ہیں ان میں میرؔ کے یہاں عام طور پر داخلی پہلو اور غالب کے یہاں اکثر خارجی پہلو ہی نظر آتا ہے۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا ؛ اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا (غالب)

ہوں زرد غم تازہ نہالان چمن سے ؛ اس باغ خزاں دیدہ میں ہیں برگ خزاں ہوں (میر)

مضمون یکساں ہے لیکن رنگ کی زردی کی توجیہہ غالبؔ کے یہاں کچھ بے معنی سی ہے وہ کون زندگی ہے جس کے لئے موت کا کھٹکا نہیں ہے پھر یہ رنگ کی زردی کا سبب کیسے ہوسکتا ہے اور اگر ہوسکتا ہے تو پھر ہر ایک کا رنگ زرد ہی ہونا چاہئے۔ کیونکہ سبھی کی زندگی کو موت کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔ میرؔ صاحب نے موت کی بجائے غم تازہ کو سبب قرار دیا ہے اور وہ بھی دوسروں کا۔ توجیہہ تغزل کی بہترین مثال بھی ہے۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ ؛ سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود تھا (غالبؔ)

نسبت کیا ان لوگوں سے ہم کو ٹھہری ہیں دیوانے ہم ؛ ہے فرہاد اک آدم کوہی مجنوں اک صحرائی ہے (میرؔ)

غالب نے مرنے کے لئے تیشہ کا محتاج ہونے پر کوہکن کو سرزنش کی ہے جبکہ میرؔ نے نہ صرف فرہاد کو بلکہ مجنوں کو بھی شائستگی عشق کی خلاف ورزی کا مجرم گردانا ہے۔ جس کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے ؛ عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مرزا غالب نے جن کا کلام تکرار مضامین کے لئے خاص طور پر نمایاں ہے اسی مضمون کو یوں بھی کہا ہے۔

عشق و مزدوری عشرتگہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں (غالبؔ)

تیشہ میں عیب نہیں کیوں رکھیں فرہاد کو نام ؛ ہیں آشفتہ مزاجوں میں جواں میر کئی (غالبؔ)

غالب نے تو صرف شور ہی سنکر تحقیق کر ڈالی اور کہا کہ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　　جو چیرا تو اک قطرہ خوں نکلا

جبکہ میر صاحب نے دل کی عالمگیر بلا خیزی پر روشنی ڈالی ہے۔

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش　　　سارے عالم پہ یہ بلا لایا

دل میں شوق وصل دیا دیار تک باقی نہیں　　　آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا (غالب)

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں　　　لگ اٹھی اک آگ ناگاہی کہ سب گھر پھک گیا (میر)

غالب نے جلنے والی چیز دل کو "شوق وصل" و "یاد یار" تک محدود کر دیا ہے جبکہ میر نے غیر محدود رکھا ہے، میر کے یہاں "ناگاہی" نے اور حسن دوبالا کر دیا ہے۔

نہ جب کچھ تھا خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا (غالب)

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر　　　ورنہ میں وہی خلوتی رازِ نہاں ہوں (میر)

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک　　　میں نقش پا کی طرح پائمال رہتا ہوں (میر)

ہم کہاں کے دانا تھے کون فن میں یکتا تھے　　　کیوں ہوا دشمن بارے آسماں اپنا (غالب)

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم　　　القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم (میر)

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی　　　دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا (غالب)

یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے　　　ہر گل ہے اس چمن کا ساغر بھرا لہو کا (میر)

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو　　　اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا (غالب)

اب پھر ہمارا اس کا محشر میں ماجرا ہے　　　دیکھیں تو اس جگہ کیا انصاف داد گر ہے (میر)

باقی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی　　　دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا (غالب)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا　　　دم کے جانے کا نہایت غم رہا (میر)

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے　　　بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا (غالب)

غور کیجئے اس شعر سے کیا مضحکہ خیز ذہنی تصویر ابھرتی ہے اسی مضمون کو میر نے فلسفہ کا رنگ دیا ہے۔

ذلیل اس کی گلی میں ہیں تو بے آزردگی کیسی — کہ رنجش تو وہاں ہووے جہاں ہو اعتبار اپنا (میر)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا (غالب)

قصدِ طریقِ عشق کیا سب نے بعد قیس — لیکن ہوا نہ ایک بھی اس رہ کو رد سا (میر)

میر نے جس آمد کو نظم کیا ہے غالب نے اسی کو آورد بنا کر رکھ دیا۔ بالکل ایسی ہی مثال ذیل کے اشعار میں ہے۔

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ — آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا (میر)

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا (غالب)

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں — دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانوں (غالب)

تعلیل بھدی اور سوقیانہ ہے۔ میر کی نفاست ملاحظہ ہو۔

اس نازکی سے گذرے کس کے خیال میں شب — مرجائے پھول سے ہو جو کچھ ملے دلے ہو (میر)

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح — دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں (غالب)

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان — مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا (میر)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالب)

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر — مرغ چمن نشاں ہے کسی زباں کا (میر)

یہ قطعہ چمن ہے ٹک کا ڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے (میر)

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں — اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا (ناسخ)

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں — ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں (غالب)

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں (میر)

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں (غالب)
سراہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا (میر)

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے (غالب)
بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اسکی شکل پر میں اسکا خواہاں یاں ملک وہ مجھ سے بیزار اسقدر (میر)

نہ کرشمہ یوں دے رکھا ہے مجھ کو فریب کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہئے (غالب)
جب درد دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں (میر)

میر کی آمد و سہل ممتنع اور غالب کی آورد و لفاظی کی ایک اور اچھی مثال ہے۔

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے (غالب)
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا (میر)

قیامت ہے کہ ہوئے غیر کا وہ ہم سفر غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے (غالب)
عشق ان کلہ ہے جو یار کو اپنے دم رفتن کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے (میر)

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے (غالب)
شیخ جنت تجھے، مجھے دیدار واں بھی ہر اک کا ہے جدا قسمت (میر)

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو (غالب)
تڑپ کے خرمنِ دل پر کہیں گرا نے بجلی جلا نا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا (میر)

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے (غالب)
فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے (میر)

اس سلسلے کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے ہم مثال کے طور پر غالب کی پانچ ایسی غزلیں پیش کر رہے ہیں جو میر۔ درد اور سودا کی زمینوں میں ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس شاعر کی زمین میں جو غزل کہی گئی ہے اس میں اسی شاعر کا رنگ جھلکتا ہے۔ مندرجہ ذیل دو غزلیں میر تقی میر کی زمین میں ہیں۔ اور اس قول کے بمصداق کہ:۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالب کی ان غزلوں میں میر کی سی تڑپ اور چبھن تو نہیں ہے لیکن انداز انہیں کا اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میر کی زمین میں غالب کی دو غزلیں

خود پرستی سے رہے باہمدگر نا آشنا — بیکسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا
آتشِ موئے دماغِ شوق ہے تیرا تپاک — ورنہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا آشنا
بے دماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہیں — یار تیرا جام ہے خمیازہ میرا آشنا
جوہر آئینہ جز رمزِ سرِ مژگاں نہیں — آشنا کے ہمدگر سمجھے ہے ایما آشنا
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار — سبزہ بیگانہ۔ صبا آوارہ۔ گل نا آشنا
ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے — گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلا آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

دیگر

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا — اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے غفلتِ نگہِ شوق ورنہ یاں — ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا
درسِ تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے — وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

شاید کہ مرگیا ترے رخسار دیکھ کر　　پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا
جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر　　ہر سو سوادِ جلوۂ مژگانِ حور تھا

ہر رنگ میں جلا اسدِ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلی شمعِ ظہور تھا

مندرجہ ذیل غزل خواجہ میر درد کی زمین میں ہے۔ ہم یہ دعویٰ کرنا تو مناسب نہیں سمجھتے کہ اس غزل میں درد کا سا سوز و گداز ہے لیکن سوز و گداز پیدا کرنے کی کوششیں ضرور جھلک رہی ہیں۔

درد کی زمین میں

کوشش ہمہ بیتاب تردد شکنی ہے　　صد جنبش دل یک مژہ برہم زدنی ہے
گو حوصلہ پامردِ تغافل نہیں لیکن　　خاموشی عاشق گلۂ کم سخنی ہے
دل لطف ہوائے بہ جنوں طرفہ نزاکت　　تا آبلہ دعوائے تنک پیرہنی ہے
رامش گر ارباب فنا نالۂ زنجیر　　عیش ایدر از خویش بروں تاختنی ہے
از بسکہ ہے محو بہ چمن تکیہ زدنہا　　گل برگ بہ بالشِ سرِ دِ چمنی ہے

آئینہ و شانہ ہمہ دست و ہمہ زانو
اے حسن مگر حسرتِ پیمان شکنی ہے

اسی طرح مندرجہ ذیل دو غزلیں سودا کی زمین میں ہیں۔ سودا کی برجستگی اور معانی آفرینی کی صحیح عکاسی تو یقیناً نہیں ہو سکی۔ لیکن قصائد کی تشبیب جیسا سودا کا مخصوص شکوہ تخیل و شوکت الفاظ کا انداز ضرور نمایاں ہے۔

سودا کی زمین میں

بکام دل کریں کس طرح گم رہان فریاد　　ہوئی لغزشِ لکنتِ بہ زبان فریاد
کمال بندگی گل ہے دہن آزادی　　ز دستِ مشت بر د خار آشیاں فریاد

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں ورنہ | برنگ نے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد
تغافل آئینہ دارِ خموشیِ دل ہے | ہوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحاں فریاد
ہلاک بے خبری نغمۂ وجود و عدم | جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد
جواب سنگدلیہائے دشمناں ہمت | ز دستِ شیشۂ دلہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خدا کے واسطے اے شاہ بیکساں فریاد

دیگر

جس دم کہ جادہ وار ہو تارِ نفس تمام | پیمائشِ زمینِ رہِ عمر بس تمام
کیا دے صدا کہ الفتِ گم کشتگاں سے آہ | ہے سر گردِ رہ بہ گلوئے جرس تمام
ڈرتا ہوں گرچہ گرمیِ بازارِ عشق سے | ہیں خارِ راہِ جوہرِ تیغِ عسس تمام
اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی | یک پر زدن تپش میں کارِ قفس تمام
گذرا جو آشیاں کا تصور بوقت | مژگانِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام

گذرے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسد
اب کی بہار کا یوں ہی گذرا برس تمام

تکرارِ مضامین

تکرارِ مضامین سے کسی شاعر کا کلام مبرّا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی خصوصی ذہنی رجحان اور خصوصی تاثر ایسا ضرور ہوتا ہے جو بار بار اس کے کلام میں نظر آتا ہے اور اس حد تک تکرارِ مضامین سے نہ تو دامن بچایا جا سکتا ہے اور نہ اس کو عیب سمجھا جا سکتا ہے بلکہ اس حد تک تکرارِ مضامین شاعر کے خصوصی رجحانات و تاثرات کی پختگی کا ثبوت دیگر حسنِ کلام کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن جب چند مضامین کسی شاعر کے کلام میں بار بار معمولی لفظی و معنوی ردوبدل کے ساتھ نظر آتے ہیں تو پڑھنے والوں کے ذہن میں اکتاہٹ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہم یہاں یہ بحث کئے بغیر ——— کہ مرزا غالب کے کلام میں تکرارِ مضامین کس حد تک ہے چند مضامین کے بار بار دہرائے جانے کی مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

خانہ ویرانی۔ گھر اور بیاباں کا تقابل۔ اور بیابان کی وسعت و تنگی کے مضامین تھوڑے ردوبدل کے ساتھ بار بار کہے ہیں۔ گھر اور بیاباں کی ویرانی کا تقابل ملاحظہ ہو۔

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

انھیں مضامین کے کچھ اور اشعار بھی ہیں۔

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشہ کر مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ
جس کی بہار یہ ہے پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

میں نہ روتا بھی تو یہ گھر مرا ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیل گریہ میں گردوں کفِ سلاب تھا

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

ہجوم گریہ کا سامان نہیں کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

وسعت و تنگی کے مضامین کی تکرار ایسے اشعار میں اکثر صحرا و بیاباں کی وسعت و تنگی کا ذکر کیا گیا ہے۔

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیالِ بیاباں نورد تھا

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشم حسود تھا

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کیا خوب کہا ہے یہ نہ ہوتا تو وہ ہوتا اور وہ نہ ہوتا تو یہ ہوتا۔ دو ہی تو صورتیں ہیں

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

دیکھنا یہ ہے کہ مضحک مبالغہ آرائی میں غالب کا یہ شعر آگے ہے یا ذوق کا یہ شعر کہ:-

تیرے کوچے میں تنِ لاغر ترے رنجور کا
اک غبار ناتواں ہے کاروانِ مور کا

غالب کی ایک اور ایسی ہی مبالغہ آمیز توجیہہ ملاحظہ ہو۔

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

غالب کا ایک اور بہت ہی مرغوب مضمون "فنافی الذات" کا ہے یعنی

نہ تھا جب کچھ خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اسی مضمون کی مختلف انداز میں بار بار تکرار کی ہے

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا الحق ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو منظور تنگ ظرفیِ منصور نہیں

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اسی طرح جنت اور جنت کے لوازمات کے متعلق مضامین کی بار بار تکرار فرمائی ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے حورانِ خلد سے تری صورت مگر ملے

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

طاقت دیدار کے متعلق مضامین کو بھی مختلف انداز میں ادا کیا ہے۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

اے دلِ نا عاقبت اندیش ضبطِ شوق کر کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست

دل کو نیاز حسرتِ دیدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہستی و عدم کا فلسفہ بار بار دہرایا ہے۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مخلوق خدا جہاں کہیں ہے اک ہستی نیستی قریں ہے

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم ۔۔۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ۔۔۔۔ عالم تمام حلقہ دام خیال ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ ۔۔۔۔ آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

طاقت فریاد۔ ضبط و مجبوری وغیرہ کے متعلق مضامین کی تکرار ملاحظہ ہو۔

ہم کو فریاد کرنی آتی ہے ۔۔۔۔ آپ سنتے نہیں تو کیا کیجئے
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں ۔۔۔۔ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
یوں ہی کچھ بات ہے جو میں چپ ہوں ۔۔۔۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
پر ہوں فریاد سے یوں راگ سے جیسے باجا ۔۔۔۔ اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
وائے محرومی تسلیم و بد احوال وفا ۔۔۔۔ جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں
تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو ۔۔۔۔ عذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ لگی ہے
ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھو ۔۔۔۔ ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

اس مضمون میں غالب کا یہ شعر

یوں ہی کچھ بات ہے جو میں چپ ہوں ۔۔۔۔ ورنہ کیا بات کہ نہیں آتی

واقعی بہت پر اثر سہل ممتنع اور سادہ ہے لیکن اسی مفہوم کو میر تقی میر اس سے کہیں زیادہ بے ساختگی کے ساتھ کہہ سکے ہیں۔

ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے ۔۔۔۔ نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت

متعدد دیگر مضامین میں تکرار کی صورت ملاحظہ ہو۔

تجاہل عارفانہ

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک ۔۔۔۔ ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا ۔۔۔۔ کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

قامت محبوب

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم ۔۔۔۔ میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
ترے قد موزوں سے اک قد آدم ۔۔۔۔ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جذبۂ شوق

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

دیوار سے سر ٹکرانے کی ضرورت

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے — مری قسمت میں یارب کیا نہیں دیوار پتھر کی

جفا میں فلک سے تقابل

جفا کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ — جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا
غم دنیا سے پائی بھی جو فرصت سر اٹھانے کی — فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

مرزا غالبؔ کے اچھے اشعار

کوئی بھی انصاف پسند اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ غالب کے کلام میں کچھ بڑی خوبیاں بھی ہیں اور مرزا کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ کلام غالب میں کچھ اچھے اشعار بھی ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کے مطلع دیوان کو لے لیجئے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ معرفت کا بہترین شعر نہیں ہے خالق اکبر کی صناعی کو شوخیٔ تحریر قرار دیتے ہوئے مخلوق کی بے ثباتی کو یعنی پیکر تصویر کو کاغذی پیرہن قرار دیا ہے اور اسی حیثیت کو نقش کی فریاد بتایا ہے۔ کاغذی پیرہن سے بے ثباتی کا ویسا ہی اظہار ہوتا ہے جیسے نقشِ بر آب سے ناپید و نابود ہونے کا۔ جیسے میر تقی میر نے ؎

اپنی ہستی حباب کی سی ہے

کہہ کر زندگی کی بے ثباتی کو حباب کی بے ثباتی کی تمثیل دی ہے۔ اب کوئی نقش بر آب کے عدم وجود اور "حباب کی سی" بے ثباتی کے تلازمہ سے ہٹ کر تاریخ و روایات کی آڑ لے کر کچھ کا کچھ ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اس کا کیا علاج اور پھر ایسی حالت میں جبکہ خود مرزا غالبؔ نے اپنے ایک خط میں اس شعر کی جو تشریح کی ہے اس میں انھوں نے کاغذی پیرہن کو بے ثباتی و عدم استقلال کے تلازمہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا بلکہ ایران کی قدیم تاریخی یا ماقبل تاریخ کے اس واقعہ سے مربوط کر دیا ہے کہ فریادی کاغذ کا لباس پہن کر عدالتوں میں

داد طلب ہوا کرتا تھا۔ اور خود مرزا غالب کی یہ تشریح ان کے شارحین کے لئے

سمند شوق پہ اک اور تازیانہ ہوا

اور باوجودیکہ غالب نے اپنے اکثر اشعار میں اپنی اس پالیسی کو برقرار رکھا ہے کہ ع

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

ان کے شارحین نے ہر شعر کی وضاحت میں اسی اصول سے کام لیا ہے کہ

آگاہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے

اور اسی اصول کے تحت غالب کی خود اپنی تشریح کا اشارہ پاکر شارحین نے اس شعر کو مطالب کے متعدد جامے پہنا دیئے اور اپنے اپنے پیدا کردہ مفہوم کے لئے ایران وتوران سے دلائل درآمد کرلئے۔ اگر ان دلائل اور مطالب آفرینی سے قطع نظر کر لیا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ مرزا غالب کا یہ شعر یقیناً قابل داد ہے۔

اس غزل کے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے ع

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

یہ مصرعہ بسا غنیمت ہے۔ صبح کرنا شام کا یعنی وہ رات کاٹنا جس میں شب غم یا شب فرقت کی تخصیص مضمر ہو اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنا صبح کی سفیدی اور دودھ کی سفیدی سے مرزا نے دانستہ یا نادانستہ تجنیس بھی پیدا کی ہے۔ دانستہ یا نادانستہ کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مرزا قدیم شعرا کے مقابلہ میں تجنیس کے زیادہ دلدادہ نہیں تھے۔ بہر صورت جوئے شیر لانے کی مشکلات سے رات کاٹنے کی مشکلات کی تمثیل دے کر شب فراق کی کیفیت کا اچھا اظہار کیا ہے۔ اسی کیفیت کو میر صاحب نے بھی یوں ظاہر کیا ہے کہ ع

یا شام کو رو رو صبح کیا یا صبح کو جوں توں شام کیا

اور اس مصرعہ پر میر صاحب نے جو مصرعہ لگایا ہے کوئی بھی صاحب ذوق سلیم اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس مصرعہ کے ساتھ میر صاحب کا یہ شعر،۔

بال کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل ہے سو اتنا ہے
یا شام کو رو رو صبح کیا یا صبح کو جوں توں شام کیا

شب غم کاٹنے کے متعلق تغزل کی ایک بہترین مثال ہے جبکہ مرزا نے اپنے مصرعہ پر مصرعہ لگا کر تغزل کا گلا گھونٹ دیا اور ان کا شعر بول ہو گیا کہ

کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کا کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

مرزا غالب کا یہ شعر بھی نقادوں سے داد طلب ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

اس شعر میں مرزا نے میکشی کو حصول بیخودی کا ذریعہ قرار دے کر تاثرات کا ایک لطیف انداز پیدا کیا ہے اور میکشی کی توجیہہ میں مرزا کے محاکات کا سلسلہ بیخودی پر ختم ہوا ہے۔ میکشی کی کچھ ایسی ہی توجیہہ انشاء نے بھی کی ہے اور اس توجیہہ کے لئے ان کے محاکات کا سلسلہ بیخودی پر ختم نہیں بلکہ شروع ہوتا ہے اور وہ بیخودی کی اپنے انداز میں تشریح کرتے ہیں جس کو غالب نے ضروری نہیں سمجھا۔ انشاء کا شعر ہے کہ

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

انشاء نے میکشی کی مقصود بیخودی کے لفظ کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کی تشریح بیان کر دی ہے کہ "تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر"

دونوں شعر بہت اچھے ہیں۔ مرزا اور انشاء کے محاکات کے ذکر کا یہ مقصد نہیں کہ کسی ایک کے محاکات کو برتر اور دوسرے کے محاکات کو کمتر یا پست ظاہر کرنا مقصود ہو بلکہ اس تذکرہ سے غرض صرف اتنی ہے کہ محاکات کی یکساں راہ پر مختلف منزلوں میں تکمیل محاکات کی مثال پیش کی جائے۔ دونوں محاکات اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں۔ محاکات کے اس تسلسل کی مثال میں انشاء اور میر کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں جن میں انشاء نے اپنے محاکات میں جن

حالت کو درماندگی کی انتہا قرار دیا ہے۔ اسی حالت کو میر نے آرام طلبی بتایا ہے لیکن دونوں نے اپنے انداز بیان سے اپنے محاکات کو مکمل بنا لیا ہے۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں

یہ ہے درماندگی سے حال اب اپنا کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں ! انشاؔ

ہوگا کسی دیوار کے سایے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو میرؔ

غالب کی پہلی غزل کا تیسرا شعر ہے۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یہ شعر مرزا صائب کے انداز میں ہے جس میں پہلے مصرعہ میں ایک دعویٰ کیا جاتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں اس دعویٰ کی توجیہہ کی جاتی ہے یا تمثیل پیش کی جاتی ہے مرزا صائب کے حسب ذیل اشعار اس کی مثال ہیں۔

فقر بے قدر کند سلطنتِ عالم را
ہوسِ تخت نہ باشد پسر ادھم را
میکند کار خرد نفس چوں گردید مطیع
دزد چوں شحنہ شود امن کند عالم را
خورد مشمار گنہ راکہ گناہے است عظیم
گنہ مے کرد ز فردوس بروں آدم را

علیٰ ہذا القیاس

یا مرزا صائب کا یہ شعر کہ

امید فیض ز نو دولتاں مجو صائب
کہ نونہال کجا طاقت ثمر دارد

غرض کہ مرزا غالب نے بھی اپنے اس مصرعہ میں کہ :-

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے

ایک دعویٰ کیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں اس کی توجیہہ میں تمثیل پیش کی ہے لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ متذکرہ بالا مثالوں میں مرزا صاحب نے اپنے دعووں کی جو پُر محل اور مسکت اشال توجیہہ میں پیش کی ہیں غالب کی توجیہی تمثیل ویسی نہیں ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ غالب کی تمثیل مشاہدات کی روشنی میں نہیں بلکہ مفروضات کی روشنی میں ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مرزا نے "سینۂ شمشیر" اور "دمِ شمشیر" کے مفروضات ثبوت میں پیش کئے ہیں اور شعر کی سلاست و برجستگی کو ختم کر دیا ہے۔

سینۂ شمشیر اور دم شمشیر کی تمثیل سے وہ بھیانک انداز پیدا کر دیا ہے جس کا تغزل مشکل ہی سے متحمل ہو سکتا ہے اور جس انداز کے لئے غالب کے ہمعصر ناسخ وہی شہرت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے ان اشعار سے ظاہر ہے۔

کوئے جاناں کو چلے جب ہم اندھیری رات میں
آگے آگے جائے مشعل آتشیں نالے ہوئے

دیکھنا ناسخ ذرا شیخ معمم کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

غور کیجئے ان اشعار سے کیا ہیولیٰ ذہن میں ابھرتا ہے۔

مرزا غالب کا یہ شعر بھی بہت اچھا ہے۔

ترے قدِ موزوں سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

قیامت کے فتنے اور قد محبوب کے فتنے کا بڑے اچھے انداز میں تقابل کیا ہے۔ اور محبوب کے قد کے فتنے سے قیامت کے فتنے کو بقدر قد آدم کم قرار دیکر نابود بنایا گیا ہے۔ بعض لطیف ذہنوں پر یہ قد آدم کی پیمائش کا انداز بار ہو سکتا ہے لیکن اس

کے باوجود شعر بہت اچھا ہے۔ اس مضمون کو قد کی پیمائش کے کاروبار سے ہٹ کر جذبات کو یوں بھی سجایا گیا ہے، اور تنزل کے سانچے میں یوں بھی ڈھالا گیا ہے کہ

تفاوت قامت یار اور قیامت میں ہے کیا ممنوںؔ
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے (ممنوںؔ)

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا!

مرزا کا یہ شعر بھی بہت اچھا ہے۔ اس شعر میں درد کے استقلال کے بھرم پر فخر کیا گیا ہے۔ دوا کے بے اثر ہونے اور درد کے دور نہ ہونے پر دل کو تسکین دی گئی ہے کہ درد کا بھرم رہ گیا ہے۔ اور وہ دوا کا احسان مند نہیں ہوا۔ توجیہہ کے انداز نے شعر میں کسی حد تک تصنع پیدا کر دیا ہے جبکہ درد یا بیماری دل کے لا علاج و مہلک ہونے پر میرؔ صاحب نے دردناک انداز میں اظہار افسوس کیا ہے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

میرؔ صاحب کا شعر تاثرات کے فطری انداز سے بہت زیادہ قریب ہے۔ لیکن غالبؔ کا شعر بھی اپنی جگہ بہت خوب ہے۔ اسی تاثر کو یوں بھی ادا کیا گیا ہے۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
مریض عشق پر رحمت خدا کی

مرزا محبوب سے تعلق برقرار رکھنے کے لئے اس کے لطف و کرم سے مایوس ہو کر اس کی جانب سے اظہار عداوت کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہیں اور اس جذبے کو بڑے اثر انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ایسے ہی مفہوم کو محمد میراثر نے بھی اس طرح ادا کیا ہے۔

کیجئے نا مہربانی ہی آکر
مہربانی اگر نہیں آتی

دونوں شعرا اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں اور دونوں شعرا نے اپنے اپنے انداز میں بہت خوب کہا ہے۔

مرزا غالب کا ایک اور شعر جس کو ان کے شارحین نے معنی آفرینی کی جولانگاہ بنایا ہے۔

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق خدا نے
وہ جن کی کہ تھی درخورِ لعل و گہر انگشت

کئی شارحین نے "دیداں" کو "دنداں" پڑھ کر شعر کو حسب ذیل شکل دے کر شرح لکھی ہے کہ:۔

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق خدا نے
وہ جن کی کہ تھی درخورِ لعل و گہر انگشت

اور پھر اس شعر کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ یہ افسوسناک بات ہے کہ جن لوگوں کی انگلیوں میں لعل و گہر کی انگوٹھیاں ہوتی تھیں ان لوگوں کی انگلیوں کو دنداں کا رزق بنا دیا گیا ہے اور پھر انگلیوں کے رزق دنداں بننے کی یہ شکل ظاہر کی گئی کہ دانتوں میں انگلیاں داب لیں یعنی اظہار حیرت کیا۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ صرف دیداں، کو جس کے معنی کیڑے ہیں۔ دنداں ثابت کرنے کے لئے یہ عجیب و غریب معنی شعر کو پہنانے کی کوشش کی گئی۔ اول تو رزق انسان یا حیوان کسی جاندار کا ہوتا ہے ان کے اعضا کا نہیں۔ اناج پھل وغیرہ ہمارا رزق ہیں۔ ہمارے دانت۔ ہماری زبان۔ ہمارے حلق اور ہماری آنتوں وغیرہ کا رزق نہیں ہیں۔ پھر بھی اصطلاحاً کسی عضو کا رزق اناج پھل گوشت وغیرہ نہیں بلکہ اس سے متعلق چیزیں ہو سکتی ہیں اور اس طرح

زبان کا سرمایہ یا رزاق نطق کو اور دنداں کا سرمایہ یا رزق چمک دمک کو اصطلاحاً کہا جائے تو طبیعت کو ناگوار نہ ہوگا جیسے کہ حسب ذیل شعر میں کہا گیا ہے۔

اے ذکرِ تو سرمایۂ گفتار زبانہا

وے فکرِ تو پیرایۂ رخسار روانہا

لیکن غالب کے شارحین نے انگلی کو دنداں کا رزق بنا دیا۔ محض شعر میں دیداں کی دنداں سے تصحیف کرنے کے لئے۔

ورنہ دراصل مرزا کا یہ شعر کافی واضح اور سادہ ہے اور ان کا مطلب اس شعر میں یہ ہے کہ جن لوگوں کی انگلیوں میں ہیرے جواہرات کی انگوٹھیاں ہوا کرتی تھیں وہ بھی مرنے کے بعد کیڑوں کا رزق ہو گئے۔ بالکل ایسے ہی انداز میں جیسے یہ کہا جائے کہ جن لوگوں کے سروں پر تاج تھے وہ بھی زمین کی تہہ میں مدفون ہوئے یا جو لوگ محلوں میں رہتے تھے وہ بھی قبروں میں سو گئے۔ وغیرہ۔ ہاں یہ بات ضرور محسوس ہوتی ہے کہ غالب نے دولت وثروت اور تزک و احتشام کی ان تمام صورتوں سے کہ جن کے سروں پر تاج تھے۔ جن کے دروازے پر ہاتھی جھولتے تھے۔ جن کے خزانوں میں ہیرے موتی کے ڈھیر تھے یا جن کے گلے میں ہیرے جواہرات کے ہار تھے وغیرہ سے ہٹ کر انگلیوں میں لال و گہر کی انگوٹھیوں کی تخصیص کی تلاش کیوں کی اور اس کو مرزا کی ذہنی اپج سمجھ کر خاموش ہو جانا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مرزا غالب کے اچھے اشعار کی فہرست میں ان کے حسب ذیل اشعار کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

یونہی کچھ بات ہے جو میں چپ ہوں

ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی!
اب کسی بات پر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مخلوق خدا جہاں کہیں ہے
اک ہستی نیستی قریں ہے

"ہستی نیستی قریں" کی معنی آفریں ترکیب غالب ہی کا حصہ ہے۔

اسی مضمون کا دوسرا شعر ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

غالب کے اشعار میں "ہاں" کے جو مختلف انداز ہیں اور جس کے تحت ہاں کے مختلف معانی ظاہر کئے گئے ہیں انھیں میں سے اس شعر میں بھی ہاں کا ایک اچھا اور برجستہ استعمال کیا گیا ہے۔

"ہاں" کے کچھ اثر انگیز استعمال غالب کے یہاں حسب ذیل ہیں ۔

<u>ترغیب کے طور پر استعمال</u>

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

<u>چیلنج</u>

ہاں مہہ تو نہیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

توجہ

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

چلئے یوں سہی

ہاں وہ نہیں وفا پرست جائیے بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

اس میں شک نہیں کہ مرزا نے مختلف موقعوں پر "ہاں" کو مختلف مقاصد کے تحت خوب استعمال کیا ہے۔ یہاں ایسے اشعار کی فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں بلکہ ہم غالب کے اچھے اشعار کی مثالیں پیش کر رہے تھے۔ اور اس سلسلے میں حسب ذیل اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہمکو

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی!

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتے ہیں رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو!
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو!
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
مگر مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

مندرجہ بالا اشعار سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا کے اچھے اشعار وہی ہیں جو ان کے مخصوص رنگ سے جس کے لئے ان کو شہرت دوام حاصل ہے الگ ہیں اور ان میں سے اکثر اشعار میرؔ کے رنگ میں ہیں۔ حسب ذیل شعر میں میرؔ کا رنگ کس قدر غالب ہے،

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

کچھ اور اشعار ایسے ہیں جو اچھے تو ہیں لیکن یا تو ان میں لفظی بھونڈا پن بے لطفی پیدا کر دیتا ہے یا معنوی شوخی و شرارت ذوق سلیم پر گراں بار ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے دل میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بس گیا بھی واں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلا مرے آگے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

مندرجہ بالا اشعار میں کچھ تو ایسے بھی ہیں جو ذوق سلیم تو کیا اخلاق کو بھی مجروح کئے بغیر نہیں رہتے۔

مرزا غالب کے کچھ بہت اچھے اشعار ایسے بھی ہیں جو تشریح کا بار بھی نہیں برداشت کر سکتے۔ اور مرزا غالب کے ایک درجن سے زائد شارحین بھی ہزار کوششوں کے باوجود ان اشعار کو مطالب کے سانچے میں نہ ڈھال سکے۔ جو شارحین زیادہ ماہر اور چالاک ہیں انھوں نے اپنی فنکاری سے کام لیتے ہوئے صرف نظم کو نثر بنا کر رکھ دیا ہے کچھ شارحین جو اس فن میں چوک گئے ہیں انھوں نے ترجمہ کر دیا ہے اور جن شارحین نے مطالب بیان کرنے کی کوشش میں دائیں بائیں ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ وہ خود بھٹکے ہوئے راہبر نظر آتے ہیں۔

دیکھئے کتنا سادہ ساخت کا شعر ہے۔ اور شعر میں کیسے سہل اور آسان الفاظ استعمال کئے گئے ہیں لیکن شعر کا مطلب و مقصد شارحین بے چارے کہاں سے پیدا کریں جبکہ خود شعر ہی میں یہ مقصد مضمر ہے کہ وہ مطلب و مقصد سے مبرا ہے۔

وہ شہر میں جب ہیں تو ہمیں کیا جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

اس شعر کا مطلب بیان کرنے میں شارحین نے بڑے بڑے چکر دیئے ہیں۔ دل وجان کی سستی سرکاری دکانیں کھلوانے اور پھر اس سے ان کے شہر میں موجود ہونے سے ربط کچھ بھی تو سمجھ میں نہ آسکا۔ دل وجان کے بازار سے تو جنگلات کا بازار بہت مناسب معلوم ہوتا ہے جس کا کہ غالب ہی کے ایک ہمعصر مومن نے ذکر کیا ہے۔

کر علاج جوش وحشت چارہ گر
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

مومن نے چارہ گر پر بھرپور طنز کیا ہے کہ آیئے اور کیجئے جوش وحشت کا علاج اور کس طرح کہ بازار سے ایک جنگل خرید کر مجھے لا دیجئے یعنی نہ بازار سے جنگل خریدا جاسکے گا نہ چارہ گر میرے جوش وحشت کا علاج کر سکے گا۔ اور اس طرح مومن کا یہ شعر بہت خوب ہے۔ لیکن غالب کے شعر میں بازار سے دل وجان کی خریداری اور اس پر ان کے شہر میں موجود ہونے کی اجارہ داری ان سب باتوں نے غریب شارحین پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔

غالب کا یہ شعر بھی بہت مشہور و مقبول ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اسی مفہوم کو محمد میر آخر نے یوں ادا کیا ہے۔

نہیں معلوم دل پہ کیا گذری
ان دنوں کچھ خبر نہیں آتی

اور ضیا شاہجہانپوری نے یوں کہا ہے۔

آپ کو آپ میں نہیں پاتے
آہ کیدھر بہک گئے ہم

مرزا کا شعر ہے۔

جب وہ جمالِ دلفروز صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

اسی مضمون کو میر صاحب اس طرح بیان کر گئے ہیں۔

کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ منہ پر اپنے ان نے گو دیدار کو عام کیا

محبوب کے نقش قدم دیکھ کر غالب نے اپنے تاثرات کو اسطرح الفاظ کا جامہ پہنایا۔

دیکھو تو دلفریبیِ انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

بالکل ایسے ہی تاثر کو سودا اس طرح کہہ گئے ہیں۔

مرغ دل نقش قدم وار کریں وقت شکار
گل کھلاتے گئے گل چھرے اڑاتے آئے

غالب نے چھیڑے جانے پر اشکوں سے طوفان بہا دینے کی دھمکی دی ہے۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

حزن و بیکسی کے اظہار میں غالب نے کچھ رجزیہ انداز اختیار کیا ہے۔ اس مضمون کو انشا حزن و ملال اور بیزاری کے بھرپور انداز میں یوں کہہ گئے ہیں۔

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مرزا غالب کے مندرجہ بالا اشعار اور شعرا ما قبل کے اشعار سے ان کے تقابل کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ غالب کے چند اچھے اشعار میں حسن و خوبی کا سبب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے کوئی نیا یا اچھوتا تخیل پیش کیا ہے بلکہ کلام سے اکتساب کر کے اشعار میں خوبی پیدا کی گئی ہے۔

ختم شد

کتبہ:۔ رحمت علی خاں مصطفےٰ آبادی۔ چاندنی محل دہلی

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

غالبؔ انگریزی میں

اختر صدیقی

ناشر
بھارتی پبلیکیشنز
۲۰۵ گڑھیا جامع مسجد
دھلی ۶